Monthly AWAMI JAMHURIAT
عوامی جمہوریت
ماہنامہ جنوری/ فروری 2018

☆
اشاعت کا
50واں سال

عاصمہ جہانگیر، عزم و ہمت، روشن خیالی اور جدوجہد کا نشان

عوامی ورکرز پارٹی پنجاب نیشنل کمیٹی کا اجلاس منعقدہ لاہور

اسلام آباد میں پارٹی کے ایک نو تشکیل شدہ پارٹی یونٹ کے شرکاء سے مرکزی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ فرمان علی کا خطاب

عوامی ورکرز پارٹی برطانیہ اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے زیر اہتمام تقریب پارٹی رہنما اور اقبال لالہ اور ضیاء الدین یوسف زئی کا خطاب

عوامی ورکرز پارٹی کے ارکان پریس کلب کے باہر مطالبات کے حق میں مظاہرہ کر رہے ہیں

ماہنامہ

MONTHLAY
AWAMI JAMHURIAT
LAHORE

عوامی جمہوریت

لاہور

شمارہ نمبر۔1

جلد نمبر۔14

CPL No

279

جنوری۔فروری 2018

قیمت:30روپے

ایڈیٹر

اختر حسین

مجلس ادارت

عابد حسن منٹو

مسلم شمیم' صباالدین صبا' توقیر چغتائی'

اثر امام' عابد شکیل فاروقی

منیجنگ ایڈیٹر

اے آر عارف

سرکولیشن منیجر

اشتیاق اعظمی

اداریہ		1
عوامی جمہوریت کے......	ڈاکٹر شاہ محمد مری	3
تھیوکریسی' سیکولرازم......	مسلم شمیم	5
منو بھائی......!	ڈاکٹر سید جعفر احمد	8
اکیسویں صدی کا سوشلزم	اثر امام	13
ایمنسٹی اسکیم اور......	نجم الحسن عطا	15
طلبا کے ساتھ ناروا سلوک	ڈاکٹر توصیف احمد	18
عمران خان کی......	عابد شکیل فاروقی	19
ٹیکنالوجی نے کیا کیا؟	محمد سعید	21
مسئلہ کشمیر......	اثر امام/مسلم بجو	24
ایک نظر	رپورٹ: عابد شکیل فاروقی	31

لاہور آفس 5 میکلوڈ روڈ لاہور' پاکستان

فون:042-37353309-37357091

فیکس:94-42-36361531

کراچی آفس:201-204 یورالا سینٹر نمبر 1 فاطمہ جناح روڈ' صدر کراچی

Email:awami.jamhuriat@gmail.com

اداریہ

عاصمہ جہانگیر' عزم و ہمت' روشن خیالی اور جدوجہد کا نشان

۱۱ فروری ۲۰۱۸ء کو کراچی لٹریچر فیسٹیول میں عاصمہ جہانگیر کی اچانک موت کی خبر سے ہر شخص اشکبار تھا اور کیوں نہ ہوتا' کیونکہ وہ علم تعلیم و تحقیق' سیکولر فکر' بنیادی انسانی و سیاسی حقوق' مذہبی فرقہ واریت سے بالاتر' درمیانے طبقے' پسماندہ طبقات' مزدوروں' کسانوں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والے ہر روشن خیال انسان کی آواز تھیں' گوکہ ان کا کسی سیاسی پارٹی سے باقاعدہ تعلق نہیں تھا لیکن ان کا تعلق ہر اس فرد اور تنظیم و تحریک سے تھا جس پر معاشی و سیاسی جبر اور ظلم و زیادتی ہو رہی ہو۔ قطع نظر کہ وہ اس سے نظریاتی طور پر اختلاف ہی کیوں نہ کرتی ہوں' ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور ان جیسے کئی افراد کی گرفتاری اور اذیت پر ان کا احتجاج واضح مثالیں ہیں۔ خواتین کے خلاف امتیازی قوانین' پدرسری نظام کا جبر' سماج میں عورت کی معاشی و سیاسی برابری کا سوال ہو یا اقلیتوں کے خلاف جبر و امتیاز یا بھٹہ مزدوروں' کسانوں کے معاشی جبر و ظلم کے خلاف جدوجہد' فوجی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف جمہوریت کی جدوجہد ہو یا حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیوں کی منافقت یا عدلیہ کا اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز ہو یا نظریہ ضرورت کے تحت مصلحت پسندی و تابعداری' تمام مسائل پر عزم و ہمت کے ساتھ آواز بلند کرتیں اور ان کے خلاف عملی جدوجہد کرتی تھیں۔ پاکستانی معاشرے کے اندر ہر قسم کے کذب و ریا کے خلاف کفر کا نعرہ عاصمہ جہانگیر کا امتیاز تھا۔ اسی لیے رجعتی حلقوں اور ریاستی اداروں کی طرف سے ان کی مخالفت بھی انہی کا اثاثہ تھا' کبھی ان کے خلاف غیر مسلم ہونے اور کبھی ملک دشمن' بھارت کا ایجنٹ ہونے کے الزامات تو موت کے بعد بھی لگائے گئے ''شرم ان کو مگر نہیں آتی'' ان کے اسی امتیاز نے ان کو ایک بین الاقوامی شخصیت بنا دیا تھا۔ ان کی موت اور جنازے میں ہزاروں کی تعداد میں سماج کے ہر طبقے کی شرکت اور جنس کی تفریق کے بغیر خواتین و مردوں کی ایک ساتھ نماز کی ادائیگی نے بھی روایتوں کے بت توڑ دیے اور یہ امید پیدا کر دی ہے کہ ان کی آواز کو بلند کرنے والے ہزاروں' لاکھوں لوگ موجود ہیں گوکہ ان کی جیسی قیادت کی کمی کو پورا کرنے میں وقت لگے گا لیکن جبر و امتیاز کے خلاف مزاحمت اور انسانی برابری کے لیے جدوجہد کی آواز بھرپور انداز میں بلند ہوتی رہے گی۔

پارلیمنٹ کی بالادستی کا سوال

پاکستان میں پارلیمنٹ کی بالادستی ہمیشہ ہی سوالیہ نشان رہی ہے۔ آزادی کے وقت ۱۹۳۵ء کے آئین کے تحت قائم کی گئی پارلیمنٹ کو گورنر جنرل غلام محمد نے توڑ کر نیست و نابود کر دیا اور پھر اپنی مرضی کی نام نہاد برابری کی بنیاد پر پارلیمنٹ تشکیل دی گئی جس کو اسی کے دیے گئے ۱۹۵۶ء کے آئین کے ساتھ فیلڈ مارشل ایوب خان نے مارشل لا نافذ کر کے دفن کر دیا۔ جنرل یحییٰ خان نے پہلی دفعہ عام انتخابات کے تحت منتخب پارلیمنٹ تو کیا ملک ہی توڑ دیا۔ باقی ماندہ نئے پاکستان کی پارلیمنٹ نے ایک حد تک متفقہ آئین تو دیا مگر اس کے تحت پارلیمنٹ کی بالادستی تو کیا قائم ہوتی فوجی آمر جنرل ضیاالحق نے آٹھویں ترمیم کے ذریعے آئین کی جمہوری اور وفاقی بنیادوں کو ہی ختم کر دیا اور آئین میں وفاقی شرعی عدالت کو داخل کر کے خاص کر آرٹیکل 203-D کے ذریعے پارلیمنٹ کی بالادستی کو فیڈرل شریعت کورٹ کے تابع کر دیا۔ ان تمام ترامیم کو آنے والی سول حکومتوں اور آمر جنرل پرویز مشرف نے قائم رکھا۔

پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور دیگر حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیاں جو اٹھارویں ترمیم کا سہرا اپنے سر سجاتی ہیں انہوں نے کئی موقع پرستیوں اور مصلحتوں کے تحت فوجی آمروں کی تمام باقیات کو آئین سے ختم نہیں کیا جس میں خاص کر آرٹیکلز 63، 62 اور 203-D شامل ہیں۔ پہلے آرٹیکل 58(2)B کے ذریعہ سول حکومتوں کو برخاست کیا جاتا تھا اور اب عدالت عظمیٰ کے ذریعے آرٹیکل 62، 63 کے ذریعے وزیراعظم کے صادق اور امین نہ ہونے کی بنیاد پر برخاست کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کے متعلق آٹھویں ترمیم کے ذریعہ جو طریقہ کار تبدیل کیا گیا تھا اس کو بھی عدالت عظمیٰ نے اپنی بالادستی کے خلاف سمجھا اور فیصلے میں کہا کہ اگر ججز تعیناتی کے معاملے پر نئی ترمیم نہ لائی گئی جس سے جوڈیشل کمیشن میں ججوں کی بالادستی قائم ہو تو سپریم کورٹ پوری اٹھارویں ترمیم کو ہی ختم کر دے گی۔ اور اس طرح پارلیمنٹ کو انیسویں آئینی ترمیم لانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس ترمیم کے نتیجے میں قائم جوڈیشل کمیشن کی کارکردگی اور نتائج پر وکلا برادری احتجاج کر رہی ہے۔ اعلیٰ عدلیہ میں ججوں کی تعیناتی اور اختیارات پر گزشتہ دنوں بحث کے حوالے سے معزز چیف جسٹس آف پاکستان نے یہ فرمایا ہے کہ اگر پارلیمنٹ کو آئینی ترمیم کا اختیار ہے تو ہمیں اسے رد کرنے کا بھی اختیار ہے اور وہ اپنا یہ اختیار پوری قوت سے استعمال کریں گے۔

دوسری طرف اسٹبلشمنٹ کی پالیسی اور سیاسی پارٹیوں کی اپنی کمٹمنٹ کا سوال ہے پارلیمنٹ میں طے کیا گیا تھا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ کی جنگ میں اپنی فوج کو استعمال نہیں کرے گا مگر اسٹبلشمنٹ نے اپنے زور پر ہی جنرل راحیل شریف کو اس نام نہاد اسلامی فوج کا سربراہ بننے کی اجازت دے دی جو ایک مسلمان ملک یمن میں لڑ رہی ہے جس میں سب سے بڑا کردار سعودی عرب کا ہے اور پھر اپنے طور پر ہی فیصلہ کر کے مزید فوج سعودی عرب بھیجنے کا آئی ایس پی آر کے جنرل نے اعلان کر دیا۔

اس طرح پارلیمنٹ کی بالادستی ہر سطح پر چیلنج کی جا رہی ہے جس سے پورے جمہوری نظام کو ہی خطرہ لاحق ہے یہ وقت تمام سیاسی قوتوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ اگر وہ ملک میں جمہوری ادارے اور پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں تو پھر بڑے پیمانے پر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ڈائیلاگ اور غیر جمہوری قوتوں کے خلاف جدوجہد کی سمت متعین کریں۔

''عوامی جمہوریت'' کے پچاس سال

ڈاکٹر شاہ محمد مری

دیگر جانداروں کے مقابلے میں انسان کیوں روبہ ترقی ہے؟۔ اُس کے ارتقا کا راز کیا ہے؟۔ نہ صرف یہ کہ وہ معدوم نہیں ہوتا، نہ صرف یہ کہ وہ جوں کا توں بھی نہیں بلکہ وہ تو روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنی زندگی بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد کرتا رہا ہے۔ جاری وساری کارواں۔

انسانی ارتقا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ثبات صرف اُس کے اِس کارواں کو ہے ۔کاروان گر بدلتے جاتے ہیں، کارواں کا سالار بدلتا رہتا ہے، اس میں موجود لوگ، اُن کی صدائیں سیٹیاں، بھیڑوں کی گھنٹیاں، رنگت اور خواص تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اِس کے پڑاؤ کی جگہیں، چراگاہیں، چیک پوسٹیں بدلتی رہتی ہیں۔۔۔ مگر اس کے کارواں کو دوام ہے۔۔۔ ''جبلّی نہیں بلکہ شعوری طور پر اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا کارواں''۔

میں عوامی جمہوریت کے کارواں (جو خود کسی اور کارواں کا تسلسل تھا) میں 1971 میں شامل ہوا۔ اُس وقت جب یہ رسالہ ابھی محض چار سال کا بچہ تھا اور میں اپنے گاؤں اور دیگر چھوٹے چھوٹے قصبوں سے علم کا پیچھا کرتے کرتے ایف ایس سی کے مست والھڑ فرسٹ ایئر کا طالب علم بنا تھا۔

علم کی شعاعیں تو چہار سُو پھیلی ہوتی ہیں۔ شعاعوں کے سمو لینے کی استطاعت البتہ مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی ہے ۔میرا گاؤں ماوند چونکہ پرائمری سکول تک تھا، اس لیے مڈل پڑھنے کے لیے کوہلو اور بارکھان جانا پڑتا تھا ۔میٹرک کے علم کی شعاعیں سمیٹنے کی جگہ دکی کے ہائی سکول میں میسر تھی۔ اور انٹر میڈیٹ تک کے علوم کی روشنی کا پاور ہاؤس سبی کو بنا دیا گیا تھا۔ چنانچہ مجھے انٹرمیڈیٹ کی سطح کے علم کے کنڈنس کردہ بنڈل نے چاکرو گوہرام کی تمیں سالہ رزم گاہ سبی میں آن لیا تھا۔ جہاں علاقے کا واحد کالج موجود تھا۔

اُس زمانے کے بلوچستان کا سماجی معاشی پس منظر یہ تھا کہ میر وسلطاں کی مکمل گرفت تھی۔ شرف وشاہی موروثی ہوا کرتی تھیں۔ تحکم اور اَمر کے آگے بس اطاعت ہی چلتی تھی۔۔۔ سرخم، یا، سرقلم۔ باغی کے قتل کی جگہ پہ پتھروں کی ڈھیری کو ''چیذغ'' کا نام دیا جاتا تھا۔ حصولِ علم کی تمنا غیرت کے استحقاق کو مجروح کرنا گردانی جاتی تھی۔۔ ماقبل فیوڈل اقدار دائمی، سخت گیر اور حتمی تھیں۔ (اب بھی صورت ویسی ہی ہے)۔

اپنی آبائی وادی کے محدود آسمان پر جو طبقے حکمرانی پہ نظر آتے تھے، وہی بارکھان میں کھیتران کے قبیلے میں بھی تھے۔ اور وہی دُکی نامی پشتون قصبے میں میٹرک کرتے ہوئے میں نے چکھے تھے: فیوڈلزم کے ستارے۔ متمکن، محکم، متکبر۔ سماجی ساخت یہ تھی کہ عوام کے اوپر چھوٹے وڈیرے تھے، جن کے اوپر تعداد میں کم مگر اختیار میں نسبتاً بڑے وڈیرے براجماں تھے، اُن کے اوپر مزید بڑے وڈیرے۔۔۔ سلسلہ اوپر اٹھتا جاتا تھا۔ وڈیروں کی تعداد کم ہوتی جاتی تھا مگر حشم وجاہ بڑھتا جاتا تھا۔۔۔ حتیٰ کہ پرائمڈ (اہرام) کی چوٹی پہ ایک ہی دمکتا چمکتا ستارہ، جلوہ افروز تھا: سردار۔ جو سارے اختیار واقتدار کا حتمی مالک تھا۔

میں تشنگانِ متبادل میں شامل تھا۔ اظہار تو نہ تھا کہ شعور نہ تھا مگر متبادل کی تلاش پہ تو معاشی سماجی حالات مجبور کرتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ''تبدیلی'' کی خصوصیت کہیں انسانوں کی جبلت میں موجود ہوتی ہے۔ شعور اُس خصوصیت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

میرے گاؤں کا دانا، علم کا رسیا تھا۔ اُس دانا کے پاس تعلیم کی کوئی ڈگری نہ تھی، لیکن وہ علم کو ہر سماجی مرتبے سے بلند سمجھتا تھا۔ چنانچہ وہ آس پاس بچوں کو پکڑ پکڑ کر تعلیمی جگہوں (مسجد یا اسکول) کے حوالے کرتا، یا پھر عالموں کو یہاں وہاں درسگاہیں مہیا کرتا تھا۔ میرا باپ تھا وہ۔

تاریخ کے اندر یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ایک سماج کبھی کبھی مکمل طور پر جمود اور سکتے میں آجاتا ہے۔ وہاں کوئی (Qualitative) حرکت نہیں ہوتی، گھپ اندھیرا مسلط ہوجاتا ہے۔ بلوچستان اُسی ڈارک ایج کی حالت میں تھا۔ کوئی اُشاری داخلی طبقاتی چقلشیں امکان میں ہوتیں بھی تو اُن پر داخل کے

بجائے خارج قبضہ کر جاتا۔ یوں ہمارے داخلی تضادات ہمیشہ بیرونی دشمن سے نمٹنے کی خاطر پوسٹ پونڈ ہو کر بے دَم ہوتے رہے ہیں۔ اور یوں سماج کا داخلی منظر نامہ سکوت و جمود میں رہا ہے۔۔ لگتا ہے کسی بہت بڑے ''عامل'' کی دائمی سُن کر دینے والی دم چُھو کا ''معمول'' سماج ہو یہ۔ فیوڈل بنیاد پرستی اس کی حنوط شدہ ممی کو غیرت اور رواج کی پٹیاں لپیٹے رہتی ہیں کہ ہاتھوں میں جنبش ممکن نہیں رہتی اور آنکھوں میں دَم روزن کی تلاش میں دَم توڑ جاتا ہے۔

اچھے بھاگ نہیں ہوتے اُس شخص، اُس کنبے، اُس قوم، اور اُس سماج کے جو ''خود کفیل'' ہوتا ہے۔ اور ہم ایک خود کفیل معاشرے کے بچے تھے۔ قدیم کمیونزم سے نکلا خود کفیل معاشرہ۔ جس کی سرشت میں منظم درآمد کی سخت مزاحمت گُندھی ہوتی ہے۔ اور حصولِ علم کی خواہش؟۔ یہ تو غیرت و روایت و جمود و سکوت و انجماد کے دیوتاؤں کے سامنے سپارٹیکسی سزا کا مستحق ہوتی تھی۔۔۔

ایک ایسے جامد سماج سے ہم نکلے حصولِ علم کو۔ سبی کالج: فزکس، کمیسٹری، بائنی، زوالوجی پڑھنے۔

اندازہ کیجئے کہ اُس وقت ہماری حالت کیا ہوگی؟۔ پشت ہا پشت سے دیجوری جینز لیے جب اچانک کوئی جاندار، چمچماتی روشنی میں آجائے تو وہ تو نیم دیوانگی کی تجسیم بن جائے گا۔ کبھی اِس رنگ پہ لپکے گا، کبھی اُس خوشبو پہ چھپکے گا، اِس انکشاف کو سمجھے گا، اُس ادراک کو جانے گا، یہ نظریہ گود لے گا، وہ عقیدہ چُوسے گا۔ جیسے سر پہ زور سے ڈانگ لگی ہو۔

یہ صحیح ہے کہ سبی کوئی اینگلزی مانچسٹر نہ تھا، نہ ہی وہ آسٹرانومی کی کوئی مشاہدہ گاہ تھا۔ مگر یہاں کتاب تھی۔ ایسی کتاب جو پانی کو ''ایچ ٹو او'' بتاتی تھی۔ یہاں گرے وٹی پڑھانے کو فزکس کا پروفیسر غلام حسین تھا۔ پھر ریلوے سٹیشن تھا جہاں سٹیفن سن کی بنائی ٹرین چلتی تھی۔ گلیاں ایڈیسن کی بنائی بجلی سے روشن تھیں۔ یہاں گیارہ ہزار سال قبل مہر گڑھ کی ایجاد، یعنی پہیہ تھا جس پر اب صرف بیل گاڑی ہی نہیں بلکہ ٹانگے، سائیکل اور لاریاں بھی چلتی تھیں۔ دو منظم لائبریریاں تھیں، لاؤڈ سپیکر والی تین بڑی مساجد تھیں، نیپ کے جلسے ہوتے تھے جن میں غلام غوث ہزاروی عریاں لطیفوں سے مرغن سیاسی تقریریں کرتا تھا۔ تھیٹر لگتے تھے جن میں کم سن لڑکے، لڑکیاں بن کر ناچتے تھے اور نادیدوں کے دیدے نکلواتے تھے۔ جیکب آباد سے سبی، ڈیرہ غازی خان سے سبی، لورالائی سے سبی اور کوئٹہ سے سبی کے بیچ 500 میل کے رقبے میں واحد سینما گھر تھا سبی میں، جہاں مشہور تھا کہ قبائلی لوگ سٹوری کو اس قدر اصلی سمجھتے تھے کہ سخت طیش میں آکر ایمانداری سے ولن کو اپنا جوتا دے مارتے۔۔ سردیوں میں یہاں چار صدیوں سے چلتا آیا ''سبی میلہ'' لگتا تھا جس میں بھاگ ناڑی نسل کے عظیم الجثہ بیل عقل کو دنگ کرواتے تھے۔

رنگ و بو بھری اِس طبعی دنیا میں نظریات تھے جو بغیر پَر و پر، زقندیں بھر نے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے، جو بغیر درد دیے، آپ کے حواس کے ایک ایک مالیکیول کو قبضہ کیے جاتے تھے۔۔ نیشنلزم، سیکولرزم، کپٹلزم، سوشلزم۔ ایسی کشش ایسا تجسس اور ایسی تسلیم، مگر اُسی شدت کا استرداد بھی!۔ ایک دنیا تھی جو ذہن کو سرگرداں کیے رکھتی تھی۔ (ذہن کا سرگرداں رہنا کتنا اچھا عمل ہے۔۔۔ اشرف المخلوقاتی عمل!!)۔

یہاں کالج میں مجھ سے ایک برس سینئر دو چار لڑکے عجب باتیں کرتے تھے۔ وہ عجیب چیزیں پڑھتے تھے۔ ایسے نظریات رکھتے تھے جو متعدی تھے، دوسروں میں پھیلنے کی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھنے والے نظریات۔ بحثیں ایسی کرتے تھے جو سارے مروجات کو تہس نہس کرتی تھیں۔ قے آور، نفرت انگیز مگر پُر اثر باتیں۔ وقتی طور پر قابلِ نفرت باتیں مگر وہی باتیں ذہن کے کچھ حصوں پہ قبضہ کر کے انہیں اپنے نظریات نشر کروانے کا کارخانہ بنا ڈالتی تھیں۔ باتیں یہ تھیں: زمین گول ہے، بادشاہ آسمانوں کی طرف سے مقرر نہیں ہوتا، سورج اپنی جگہ پر ساکن کھڑا ہے، متحرک زمین اُس کے گرد گھومتی ہے۔ دنیا قوانین کے مطابق چلتی ہے، میٹر یعنی مادہ کبھی پیدا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی فنا ہوسکتا ہے، سارے انسانوں کی برابری والا سماج ممکن ہے۔''۔۔۔ اور سب سے گمراہ کن یہ بات: ''ہر چیز'' کا علم ممکن ہے۔

جو پہلی کتاب اِن لڑکوں نے مجھے دی وہ کم اِل سنگ کی سوانح حیات تھی۔ اُس کتاب میں اُس شخص کی تصویریں بھی تھیں۔ میں نے وہ کتاب انتہائی تلخ ذائقے کے ساتھ پڑھی۔ کوئی قبولیت تھی یا نہیں، یاد نہیں۔ مگر استرداد اِس قدر کہ اگلے دن کتاب واپس کر دی تو تصویروں پر کم اِل سنگ کی آنکھیں سلامت نہ تھیں۔ شدید کشمکش میں غلطاں جھنجلائے ذہن کے حکم سے وہ آنکھیں میرے ناخنوں نے کُھرچ ڈالی تھیں۔ یہیں، انہی لڑکوں کے پاس ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' پہلی مرتبہ دیکھا تھا، میں نے۔

(جاری ہے)

تھیوکریسی، سیکولرازم اور جمہوریت

مسلم شمیم

۲۵ر دسمبر کو قائداعظم کے یوم پیدائش کے حوالے سے ملک میں مذاکروں اور سمیناروں کا انعقاد ہوا اور قائداعظم کے تصور پاکستان پر مختلف زاویوں اور نقطہ ہائے نظر سے گفتگو ہوئی اور متضاد اور متصادم نقطہ ہائے نظر زیر بحث آئے قائد اعظم کا ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کا خطاب جو انہوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر اور سربراہ مملکت اور بانی پاکستان کی حیثیت سے کیا تھا وہ بلاشبہ ایک سیکولر جمہوری ریاست کے تصور کا حامل تھا اس ضمن میں کوئی ابہام اس تقریر میں پایا نہیں جاتا تھا وہ غور وفکر سے بھرپور تحریر شدہ تقریر تھی قائد اعظم کا یہ فقرہ "Religion has nothing to do with the business of the state" سیکولرازم کی مختصر ترین اور جامع ترین تعریف ہے لہذا سیکولرازم کو لادینیت کا ہم معنی قرار دینا عوامی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک تاریخی المیہ ہے اس وقت کی اسٹبلشمنٹ کے سربراہ چودھری محمد علی نے مذکورہ خطاب کے اس حصے کو سنسر کرنے کی ہدایت دی تھی جس میں واضح ترین الفاظ میں پاکستان کو ایک سیکولر جمہوری ریاست کے طور پر پیش کیا گیا تھا چودھری محمد علی جو بیک وقت سیکریٹری جنرل حکومت پاکستان اور کابینہ کے سیکریٹری کے منصب پر فائز تھے دراصل De - facto Prime minister اور لیاقت علی خان De- Juro prime minister تھے چودھری صاحب کی مذکورہ ہدایت پر عمل نہ ہونے کا سہرا اس وقت کے ڈان کے ایڈیٹر مرحوم الطاف حسین کے سر ہے ورنہ وہ مسخ شدہ اور ترمیم شدہ خطاب تاریخ کا حصہ ہوتا بہرحال قائداعظم کی وفات کے چند مہینوں کے بعد قرارداد مقاصد کی منظوری کے ذریعہ مذکورہ خطاب کے منشاء اور مندرجات کی نفی کردی گئی اور ۱۹۵۶ء کے آئین میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔

واضح رہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے چیف آرکیٹیکٹ چودھری محمد علی تھے جو اس وقت ملک کے وزیراعظم کے منصب پر فائز تھے انہوں نے اپنی خودنوشت "Emergence of Pakistan" میں پاکستان کے اسلامی جمہوریہ ہونے کے حق میں جو دلائل و براہین بیان کیے ہیں وہ آغاز سفر سے پاکستان پر Establishment کے مسلط ہونے کا دستاویزی ثبوت ہیں موصوف کسی قیمت پر پاکستان کو حقیقی جمہوری ریاست کی شکل میں دیکھنے کے حق میں نہیں تھے بلکہ اس کو ایک اسلامی ریاست یعنی ایک تھیوکریٹک (Theocratic) ریاست بنانے کے منصوبے پر عمل پیرا تھے۔

اس مرحلے پر تھوڑی سی نظریاتی گفتگو ناگزیر ہے پاکستان کے تناظر میں قائداعظم کے اپنے الفاظ اس باب میں یہ ہیں:

> ''ہم کس چیز کے لیے جدوجہد کررہے ہیں ہمارا نصب العین کیا ہے ہم تھیوکریسی کے لیے کچھ نہیں کررہے ہیں نہ ہمارا نصب العین تھیوکریٹک ریاست قائم کرنا ہے اور یہ کہ بہرصورت پاکستان تھیوکریٹک ریاست نہیں ہونے والا ہے جہاں ملاؤں کی حکومت ہوگی جن کا خیال ہے کہ ان کو الوہی فریضہ سونپا گیا ہے۔''

تھیوکریسی جہاں سیکولرازم سے متصادم ومتضاد نظریہ ہے وہاں جمہوریت سے بھی اس کا نظریاتی اور عملی تضاد وتصادم ہے کیونکہ جمہوریت میں ریاست کے اقتدار اعلیٰ پر عوام کا استحقاق تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ سبط حسن کے الفاظ میں:

> ''تھیوکریسی ریاست کی وہ قسم ہے جس میں حکومت کے قوانین احکام خداوندی سے منسوب کیے جاتے ہوں یا جہاں کا حاکم اعلیٰ خدا یا خدا کے اوتار یا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو دوسرے لفظوں میں تھیوکریسی وہ ریاست ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کے مالک ملک کے باشندے نہ ہوں اور نہ عنان اختیار ان کے چنے ہوئے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو جبکہ سربراہ مملکت کسی دوسرے ذریعے سے اقتدار حاصل کرکے احکام خداوندی کی ترجمانی کا مدعی ہو۔''

تھیوکریسی کا نظریہ ریاست خود ریاست کے ارتقائی سفر سے وابستہ ہے۔ ریاست معاشرے کے طبقات میں بٹ جانے کے نتیجے میں وجود میں آئی اس کا منصب حاکم طبقے کی بالادستی کا دفاع کرنا تھا۔ ریاست خواہ تھیوکریسی ہو یا بادشاہت یا کوئی اور نظام ریاست بنیادی طور پر وہ طبقاتی ادارہ ہے تھیوکریسی مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کا تحفظ کرنے والا نظریہ ہے ابتدائی ریاستیں تھیوکریسی یعنی مذہبی ریاستیں تھیں خواہ وہ وادی نیل اور وادی دجلہ وفرات کی ہوں یا وادی

سندھ اور وادی گنگ وجمن کی ۔ ہندوستان میں دیوتاؤں اور اوتاروں کے روپ میں ریاستیں قائم تھیں رام راج کا تصور اسی سلسلے کی کڑی ہے جو آج ہندوستان کی بنیاد پرست جماعتوں خصوصیت کے ساتھ R.S.S کا نصب الدین اور منزل مقصود ہے ریاست کے تشکیلی دور میں عقائد وافکار کی اجارہ داری مذہبی پیشواؤں کو حاصل تھی اور لوگوں کے ذہنوں پر انہی کی حکومت تھی یہی وجہ ہے کہ بابل' مصر' ایران' یونان' فلسطین اور ہندوستانی ریاست کو عطیہ خداوندی قرار دیا گیا حاکم وقت کو خدا یا خدا کا اوتار یا نمائندہ بنا دیا گیا اور ریاست کے احکام وقوانین کو فرمان الٰہی سے منسوب کر دیا گیا عہد قدیم میں الوہی استحقاق کا ریاستی نظریہ Divine right of kings ایک عالم گیر عقیدے کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جواب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور قصہ پارینہ قرار پایا ہے

تھیوکریسی کے آغاز اور عروج وزوال کے سرسری جائزے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تھیوکریسی کوئی ابدی اور مقدس نظریہ ریاست نہیں ہے بلکہ معاشرتی ارتقا کے ایک مخصوص عہد میں تاریخی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئی اور جب ضرورتیں باقی نہ رہیں تو تھیوکریسی کا بھی وہی انجام ہوا جو تاریخ میں غلامی کا ہوا تھیوکریسی پروہت راج اور جاگیرداری کا نظریہ ریاست تھی موجود دور میں جب صنعتی انقلاب کے باعث معاشرے کی اہمیت اور حالات زیست بدل گئے ہیں سائنسی علوم نے تھیوکریسی کے تمام اذہان ومفروضات کا بھرم کھول دیا ہے اور جاگیرداری کا چل چلاؤ ہو چکا ہے تھیوکریسی کے احیا کی کوشش ارتقائے انسانی کو پیچھے لے جانا ہے تھیوکریسی جمہوریت اور جمہوری قدروں کی نفی کرتی ہے تھیوکریسی سائنسی علوم اور سائنسی سوچ کی دشمن ہے وہ اجتہاد کے بجائے تقلید اور تحقیق وجستجو کے بجائے منقولات اور روایت پرستی کی تعلیم دیتی ہے تھیوکریسی خوف اور لالچ کی عفریتی قوتوں سے عقل وخرد کا گلا گھونٹنے کے درپے رہتی ہے تھیوکریسی ظلمت پرستوں کا آخری حربہ ہے جو خدا کی حاکمیت کی آڑ میں تنگ نظر ملاؤں کا راج قائم کرنا چاہتے ہیں جاگیرداری اور جاگیردارانہ قدروں کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور عوام کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر وہ تاریخ کا پہیہ پیچھے کی طرف گھمانا چاہتے ہیں جو قانون فطرت سے متصادم ہے لہذا ان کے انجام کا منطقی نتیجہ ناقابل فہم نہیں ہونا چاہیے۔

جہاں تک سیکولرازم کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ سیکولر نظریات جمہوریت کی طرح قدیم یونان کے مفکرین اور سائنس دانوں کے افکار کا حصہ ہیں خاص طور پر سقراط' افلاطون اور ارسطو کے فکر وفلسفہ کی بنیاد سیکولر نظریے پر استوار تھی افلاطون کی شہرہ آفاق تصنیف جمہوریہ (republic) میں جو مثالی سیاست کی بات کی گئی ہے وہ ریاست جمہوریت اور سیکولر نظریے پر مبنی تھی اس طرح سیکولر نظریے اور افکار عہد قدیم سے چلے آ رہے ہیں البتہ سیکولرازم کی اصطلاح جارج جیکب ہولی اوک (George jacab holy yoke نامی ایک آزاد خیال انگریز نے ۱۸۴۰ء میں وضع کی تھی ہولی اوک نے اس نظریے کی باضابطہ تشہیر کی اور اس غرض سے اس نے لندن میں سینٹرل سیکولر سوسائٹی قائم کی تھی ہولی اوک کا اس باب میں موقف یہ تھا کہ انسان کی سچی رہنما سائنس ہے علم وادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے ہر شخص کو فکر وتقریر کی آزادی ملنی چاہیے اور ہمیں اس دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ریاست کے عملی کردار کے حوالے سے سیکولرازم کی مختصر اور جامع تعریف اپنے شہریوں کو مذہبی امور میں غیر جانبداری کا کردار اور عمل ہے ریاست اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام رہے گی اگر خود اس ریاست کا کوئی اپنا مذہب ہوگا اس صورت میں شہریوں کے حقوق کے ساتھ یکساں تحفظ اور سلوک کرنا ممکن نہ ہوگا اور وہ شہری جو ریاستی مذہب کے ماننے والے نہ ہوں گے دوسرے درجے کے شہری ٹھہریں گے اور نتیجتاً ریاست جمہوریت کے نظام اور نصب العین کی دعویدار نہیں ہو سکتی کیونکہ جمہوریت کی اساس قانون کی حکمرانی اور سب کے لیے یکساں قانون پر استوار ہے ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس عہد کا نشان منزل جمہوری عمل پر گامزن ہونے کا نام ہے جمہوریت سے انحراف گویا عہد سے بیگانگی برتنا ہے واضح رہے کہ آج کا کوئی ملک دنیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔

جمہوریت کے فروغ اور سفر ارتقا میں چرچ سے ریاست کی علیحدگی کا مرحلہ صدیوں میں طے ہوا یورپ کو ہزار سالہ عہد تاریخ سے باہر آنے میں چار صدیاں لگیں اور عہد جدید کا آغاز سولہویں صدی سے نشاۃ ثانیہ کی جلو میں ہوا تحریک اصلاح Reformation movement اور کیتھولک چرچ سے کامیاب نبرد آزمائی کے نتیجے میں پروٹسنٹ چرچ کا پورے یورپ میں ظہور ہوا جس کے نتیجے میں قومی ریاستیں وجود میں آئیں جو سب کی سب سیکولر تھیں یعنی ان ریاستوں کا مذہبی امور میں غیر جانبداری کا کردار متعین ہوا اس طرح ۱۷۸۹ء کے بعد سے یعنی انقلاب فرانس کے زیر اثر اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین ۱۷۸۹ء کی پیروی میں یورپ کی جمہوری ریاستیں یکے بعد دیگرے سیکولر

ریاستوں میں تبدیل ہوتی گئیں اس سفر ارتقا میں جاگیر دارانہ نظام اور ادارے خصوصیت کے ساتھ موروثی بادشاہتیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے تاریخ کا حصہ بنتی گئیں اسی تناظر میں مسلم دنیا یورپ سے صدیوں پیچھے ہے کیونکہ یہاں نہ کوئی صنعتی انقلاب برپا ہوا اور نہ کسی نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا ہے اس کے برعکس اب تک مسلم معاشرے میں جو مذہبی اور اصلاحی تحریکیں گزشتہ تین صدیوں سے سامنے آئی ہیں سب کی سب احیائی تحریکیں ہیں جو عہد ماضی کے مفروضہ زریں دور یعنی جنت گم گشتہ کی بازیافت کی تحریکیں ہیں جو قانون ارتقا یعنی قانون فطرت سے متصادم ہیں لہذا اس بات میں لوگوں کی سادہ لوحی پر اظہار تاسف کرنے کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے سیکولرازم کے باب میں یہ کہنا بے محل بات نہیں کہ فکر و عمل کی قوانین فطرت سے ہم آہنگی کا نام سیکولرازم ہے اگر قوانین فطرت کی خلاف ورزی کی جائے تو انسان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم اس کلیے کی صداقت پاکستان کی تاریخ میں ڈھونڈ سکتے ہیں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ۱۱/اگست کے مشہور خطاب میں کہا تھا کہ مذہب کا امور مملکت سے کوئی تعلق نہیں یعنی قائداعظم نے ایک سیکولر جمہوری ریاست کا تصور پاکستان سے وابستہ کیا تھا جس کی نوعیت ریاست اور سیاست کے حوالے سے قانون فطرت کی سی تھی جس سے انحراف کے نتیجے میں پاکستان ۱۹۷۱ء میں شکست و ریخت سے دوچار ہوا بصورت دیگر اگر پاکستان کی سیاست اور امور مملکت جمہوری اور سیکولر اصولوں پر استوار ہوتے تو ۱۹۷۱ء کا سانحہ تاریخ کا حصہ نہ بنتا آج کا پاکستان اور اس کے حالات اسی قانون فطرت سے انحراف کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ چھ دہائیوں سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ہمارا سفر جمہوریت ہنوز روز اوّل سے آگے نہیں بڑھا ہے ملک بحران در بحران سے دوچار ہے۔ جمہوری روایت اور اقدار کے فروغ کے بجائے ہمارا معاشرہ مذہبی انتہا پسندی، راسخ العقیدگی ظلمت پرستی اور بنیاد پرستی کے بحر ظلمات میں ڈوبتا جارہا ہے خرد افروزی اور روشن خیالی کے لیے معاشرے میں دائرہ محدود تر ہوتا جارہا ہے یہاں یہ بات بتانا ضروری بلکہ ناگریز ہے کہ قائداعظم کا تصور پاکستان یعنی سیکولر جمہوری ریاست کا تصور ان کا ذاتی تصور نہیں تھا بلکہ اس باب میں انہیں برصغیر کی مسلم آبادی کی بھاری اکثریت کی تائید یعنی (mandate) حاصل تھی کیونکہ پاکستان اور تحریک پاکستان کی مخالفت میں تمام مذہبی جماعتیں خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی، جمعیت علمائے ہند، مجلس احرار اور خاکسار تحریک پیش پیش تھیں اور ان سب کا اس حوالے سے بڑا واضح موقف تھا جو کئی عشروں سے برصغیر کی مسلم آبادی کے علم میں تھا مگر انہوں نے بھاری اکثریت سے مذہبی جماعتوں کے موقف کو مسترد کرتے ہوئے قائداعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان کے حق میں واضح mandate دیا۔ اسے تاریخ کا المیہ کہیے کہ قائداعظم کی وفات قیام پاکستان کے چند ہی مہینوں بعد واقع ہوگئی اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور وہ ایک عشرہ اور زندہ رہ جاتے تو مفاد پرست حلقوں کو ان کے تصور پاکستان کی نفی کرنے اور ہائی جیک کرنے کا موقع نہ ملتا یہ حلقے شروع سے سیکولرازم کو لادینیت اور کفر و الحاد سے منسوب کر کے عوام کو اب تک گمراہ کرتے چلے آرہے ہیں سیکولرازم کو دہریت Atheism کا ہم معنی قرار دینے والے مسلم معاشرے کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کررہے ہیں اس ضمن میں ماضی قریب میں ایک ضخیم کتاب سیکولرازم۔ مباحث اور مغالطے۔ کے نام سے اسلام آباد کے ایک Think tank کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس کا حاصل کلام یہ ہے کہ سیکولرازم لادینیت کا فلسفہ اور نظریہ ہے پاکستان کے لیے یہ نظریہ ان کے نزدیک قطعی ناقابل قبول ہے سیکولر ازم کے حوالے سے یہ نقطہ نظر قطعی نیا نہیں ہے بلکہ نظریہ پاکستان کا سارا قصہ جو ۱۹۶۰ء کی دہائی میں شروع ہوا وہ دراصل قرارداد پاکستان کے پردے میں قائد اعظم کے تصور پاکستان کی نفی کرنے کے منصوبے کا تسلسل ہے بہر حال میرے نزدیک پاکستان کا مستقبل جمہوریت سے وابستہ ہے اور جمہوریت اور سیکولرازم لازم و ملزوم ہیں۔

یہاں یہ بات قارئین کے لیے بڑی معنویت رکھتی ہے کہ مسلم دنیا کے ۵۷ ممالک میں سے چند کے سوا سبھی سیکولر ریاستیں ہیں یعنی ۵۰ سے زیادہ ریاستوں کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے اور یہ ریاستیں مذہبی امور میں عدم مداخلت اور غیر جانبداری کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔ ان میں کسی نے اپنی ریاست کے نام کے ساتھ اسلامی جمہوریہ یا اسلامی مملکت کا لاحقہ نہیں لگایا ہے مگر پھر بھی المیہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جمہوری سفر ارتقا پر گامزن نہیں ہے چنانچہ وہاں سیکولرازم جمہوریت کی عدم موجودگی میں بے معنی بن کر رہ گیا ہے اور وہ ریاستیں مختلف زاویوں سے سماجی اور سیاسی پسماندگی کے گرداب میں گھری ہوئی ہیں واضح رہے کہ جدید معاشرے کا مستقبل جمہوریت اور سیکولرازم کی ہم سفری سے مشروط اور وابستہ ہے۔

☆.....☆

منّو بھائی.....مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

ایک قاری کا کسی سینیئر ادیب یا قلمکار کے ساتھ تعلق کچھ اسی طرح کا ہوتا ہے جیسا ایک مسافر کا پیچھے سے آنے والی ٹرین کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ اس ٹرین میں سوار ہوتا ہے اور آگے جا کر اپنی منزل پر اتر جاتا ہے، ٹرین آگے چلی جاتی ہے۔ بہت سے مسافر ٹرین کے آخری اسٹیشن تک اُس کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ جس اسٹیشن سے مسافر سوار ہوا ہوتا ہے وہ اُس کے ذہن سے کبھی نہیں نکلتا۔ قاری بھی یاد رکھتے ہیں کہ انہوں نے کسی قلمکار کو پہلے پہل کب پڑھا تھا۔ یہ رشتہ جتنا آگے بڑھتا ہے، ابتدائی تعارف اتنا ہی ذہن میں پختہ ہوتا جاتا ہے۔ میں ۱۹۸۱ء میں پہلے پہل منّو بھائی کا قاری بنا۔ اور اب جبکہ اُن کی وفات کے بعد اُن کا آخری کالم شائع ہوا ہے تو اس کو پڑھ کر پچھلے تقریباً تیس، پینتیس سال کا دور ذہن میں تازہ ہو رہا ہے۔ اس عرصے میں ملکِ عزیز پر کیا کچھ نہ گذری، آمریت اور جمہوریت کی کشمکش، فوجی بالادستی کی حامل ریاست، سویلین حکومتوں کی کمزوریاں اور ناکامیاں، کرپشن کی روز افزونی، انسانی جانوں کی بے قدری، مذہبی انتہا پسندی کا طوفان، پڑوسی ممالک کے ساتھ کشیدگی، 'جہاد' سے 'ردّالفساد' تک کا سفر۔ پھر ان تین، ساڑھے تین عشروں میں دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ سوویت یونین اور اشتراکی بلاک کی ستّر، پچھتّر سال بعد تحلیل اور اس کے ساتھ دنیا کی ایک بڑی آبادی کی امیدوں اور آرزوؤں کے ایک مرکز کا خاتمہ، گویا.....صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور، نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی۔ قومی ریاستوں کی سرحدیں کمزور پڑیں اور بازار کی معیشت عالمی رجحان قرار پائی۔ اُدھر ہمارے پڑوس میں واقع شرقِ اوسط میں 'عرب بہار' کی آمد اور پلک جھپکتے ہی اس کا خزاں رسیدہ ہو جانا۔ غرض ان برسوں میں دور و نزدیک، ملک میں اور باہر، اتنا کچھ ہوا کہ اس عہدِ تلاطم خیز میں سوچنے والے ذہنوں کے لیے غور و فکر کا بیش بہا سامان موجود ہے۔ منّو بھائی ایک بیدار مغز انسان تھے جن کو زندہ موضوعات تک پہنچنے اور اُن کو تخلیق کے عمل سے گذارنے کا فن آتا تھا۔ ان کے کالم گرد و پیش کو سمجھنے اور اپنے دور کے بحرانوں کا تجزیہ کرنے کی مسلسل اور معروضی کاوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک عوام دوست اور ترقی پسند ورلڈ ویو کے حامل تھے۔ سیاسیات اور ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ قلم میں روانی تھی اور تحریر میں بے ساختگی۔ سامراج کی مخالفت اور آمریتوں کی مذمت کرتے وقت اور سماجی نابرابریوں اور پسے ہوئے طبقات پر ہونے والے جبر کا پردہ چاک کرتے وقت وہ اس انداز سے بات کرتے تھے کہ اس میں فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے ایک عام فہم اور سادہ سا استدلال اپنا رنگ جماتا چلا جاتا تھا۔

۱۹۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں روزنامہ 'جنگ' نے لاہور سے بھی اپنے ایڈیشن کا آغاز کیا۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے، نئے 'اخبار' یا پہلے سے نکلنے والے اخبارات اپنے نئے ایڈیشن کے اجراء پر کچھ نئی چیزیں متعارف کراتے ہیں۔ کوئی نئے کالم، نیا لے آؤٹ، یا نئے سلسلے، تاکہ قارئین پر اپنی جدت، انفرادیت اور تازگی کا تاثر قائم کروا سکیں۔ لاہور کے 'جنگ' نے تو طباعت کا نظام ہی نیا اختیار کیا اور اردو طباعت میں ایک انقلاب آفریں قدم، کتابت کی جگہ کمپوزنگ اور نوری نستعلیق کو اختیار کر کے اٹھایا۔ پھر آزمودہ اور تجربہ کار لکھنے والوں کی ایک بڑی ٹیم کو اکٹھا کیا۔ 'جنگ' کے صفحات میں اب صفدر میر، پروفیسر وارث میر، پروفیسر محمد عثمان اور ارشاد احمد حقانی کے رشحاتِ فکر مستقلاً جلوہ گر ہونے لگے یہ سب حضرات ماضی میں مختلف مطبوعات میں اظہارِ خیال کرتے رہے تھے۔ 'جنگ' کے ان کالم نگاروں میں منّو بھائی بھی شامل تھے جو ماضی میں 'امروز' میں کالم نگاری کے جوہر دکھا کر اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ 'گریبان' اُن کے کالم کا نام تھا۔ 'امروز' میرے مطالعے میں کبھی نہیں رہا تھا۔ سو 'گریبان' سے تعارف اس کے 'جنگ' میں آنے کے بعد ہی ہوا۔ 'گریبان' کے لفظ کے ساتھ ایک چھوٹا سا خاکہ بھی چھپا تھا۔ یہ ایک ڈنڈے پر پھٹے ہوئے گریبان کی تصویر تھی۔ تصویر کو دیکھ کر ہی کالم کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ گریبان کے چاک ہونے اور معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ، جذبوں کے بحران اور آس اور پیاس کا کالم تھا۔ ۳۵ سال کے قریب یہ کالم زیرِ مطالعہ رہا۔ اس میں سماج کی عکاسی، سیاست کے اتار چڑھاؤ، ریاست کی بے مہریوں اور ہم عصر عالمی کوائف کی عکاسی تو ہوتی ہی رہی، خود منّو بھائی کا ایک بین السطور ارتقائی عمل بھی جاری رہا۔ وہ نظریاتی انسان شروع میں بھی تھے، گذرتا وقت اُن کی نظریاتی اساس کو پختگی سے ہم کنار کرتا چلا گیا۔ ایک ترقی پسند، ایک اشتراکی فکر کے علمبردار کی حیثیت سے ایک بھرپور زندگی گذار کر اور اپنی تحریروں میں مزاحمت کی ایک زندہ اور زندگی بخش روایت کو محکم بنا کر وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے ہیں۔ زمانہ اچھے لوگوں سے تو کبھی خالی

نہیں ہوا مگر ان ان دنوں ملک عزیز میں مذہبی جنونیت، توہّم پرست اور خلافِ عقل باتوں کا جو سیلاب آیا ہے اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ منّو بھائی جیسے روشن خیال اور بیدار مغز انسان سے پاکستان کا اس وقت محروم ہو جانا عقل و خرو کے محاذ کا ایک بڑا نقصان ہے۔ 'ڈیلی ٹائمز' نے اپنے اداریے میں درست لکھا ہے کہ منّو بھائی کی وفات سے پاکستان عمومی طور پر اور ہمارا مرکزی دھارے (mainstream) کا میڈیا خاص طور سے ایک مضبوط اور توانا آوازِ خرد سے محروم ہوگئے ہیں۔ 'Farewell Munnu Bhai' (editorial), Daily Times (Lahore, 21 January, 2018)

شاعر، کالم نگار، مترجم، صحافی اور سماجی اصلاح کے کاموں کو حرزِ جاں بنائے رکھنے والے منّو بھائی نے کوئی ۸۵ سال کی عمر پائی۔ وہ ۶ فروری ۱۹۳۳ء کو وزیرآباد کے ایک ایسے غریب اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جس کا گزر اوقات معمولی سی آمدنی پر ہوتا تھا۔ ان کے دادا میاں غلام حیدر قریشی مسجد کے امام تھے اور اپنے خانوادے کی پرورش جلد سازی اور کتابت کر کے کرتے تھے۔ اُس زمانے میں ایک بڑا طبقہ ہمارے دیہی علاقوں اور چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے افراد پر مشتمل پایا جاتا تھا جو رزقِ حلال پر گذر بسر کرتا تھا اور جس نے مذہب کو کاروبار اور ذاتی منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا تھا، نا ہی ابھی باہر سے آنے والی بیش بہا اعانتوں کے سیلاب نے ہماری مساجد اور مدرسوں کا رخ کیا تھا۔ منّو بھائی نے اپنے دادا ہی سے وہ لوک کہانیاں سنیں جو انسان میں دردمندی، صلح جوئی اور پیار محبت کے بیج بو دیتی ہیں۔ منّو بھائی نے بہت کم عمری میں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، مرزا صاحباں اور یوسف زلیخا کے قصوں سے محبت کا رس کشید کر کے گھٹی میں پی لیا تھا۔ ان کے والد محمد عظیم قریشی محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ منّو بھائی ۱۹۴۷ میں میٹرک کر کے گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کے بننے والے دوستوں میں شفقت تنویر مرزا بھی شامل تھے جو پنجابی ادب میں اپنا ایک بڑا نام بنا کر دنیا سے گئے۔ ۱۹۵۰ء کی دھائی میں انہوں نے راولپنڈی کے اخبار 'تعمیر' میں ملازمت اختیار کی۔ پچاس روپے ماہانہ کی تنخواہ پر انہوں نے اس ملازمت کے دوران 'اوٹ پٹانگ' کے عنوان سے کالم نگاری کا آغاز کیا۔ اس دوران انہوں نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اردو اخبار 'امروز' میں ایک نظم بھیجی۔ احمد ندیم قاسمی 'امروز' کے ایڈیٹر تھے۔ یہ نظم اخبار میں شائع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی قاسمی صاحب سے منّو بھائی کا تعلق قائم ہوگیا۔ قاسمی صاحب بہت جوہر شناس ادیب تھے۔ انہوں نے بیسیوں نئے لکھنے والوں کے اندر تخلیقی جوہر کو تلاش کرتے ہی اس کو نکھارنے کا کام کیا۔ منّو بھائی کی خوش قسمتی کہ وہ بھی قاسمی صاحب کی نظر میں آ گئے۔ ایک خیال یہ ہے کہ ان کو 'منّو بھائی' کا قلمی نام بھی احمد ندیم قاسمی نے دیا تھا۔ ایک بار وہ منّو بھائی بن گئے تو پھر کسی نے ان کے اصل نام 'منیر احمد قریشی' کو دریافت کرنے کی زحمت نہیں کی۔ 'تعمیر' سے وہ 'امروز' میں آ گئے اور یہاں اُن کے کالم کا عنوان 'گریبان' ٹھہرا۔ آئندہ زندگی اُن کا کالم اسی عنوان سے چھپا۔ 'امروز' سے وہ 'مساوات' میں گئے اور وہاں سے وہ 'جنگ' (لاہور) میں پہنچے۔ بیچ میں وہ دوسرے اخبارات میں بھی گئے مگر پھر مستقلاً 'جنگ' میں آ گئے اور آخری سانس تک 'جنگ' سے وابستہ رہے۔

صحافت ایک مقدس پیشہ رہا ہے۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی کاروباری جہت زیادہ نمایاں اور اس کے دوسرے پہلوؤں پر غالب ہوتی چلی گئی ہے۔ یہاں تک کہ آج کل کی صحافت نری کاروبار بن کر رہ گئی ہے۔ منّو بھائی نے جس زمانے میں صحافت کی وادی میں قدم رکھا تھا اُس وقت صحافت کی نظریاتی اساس بہت پختہ اور واضح تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صحافت کے بدلتے ہوئے اطوار کے باوجود منّو بھائی کے نظریاتی ابعاد اپنی جگہ برقرار رہے۔ وہ قلم کے ذریعے مجبور و مقہور انسانوں کے درد کا درماں تلاش کرتے رہے، زخموں پر مرہم رکھتے رہے اور دنیا کو بدلنے کی جوت جگاتے رہے۔

پیشہ ورانہ اعتبار سے بھی انہوں نے صحافت کے اعلیٰ معیارات کا پاس کیا۔ معروف صحافی اور کالم نگار سہیل وڑائچ کا یہ کہنا بالکل صائب ہے کہ 'اگر دنیا میں صحافت کو انسانی شکل و جسم میں آنے کا موقع ملتا تو وہ ہو بہو منّو بھائی کی شکل اور قد و قامت کی ہوتی۔ وہ مجسم صحافت اور مجسم انسانیت تھے۔ صحافت و ادب کے ہر شعبے پر ان کی مکمل دسترس تھی۔ خبر بنانے سے لے کر اداریہ لکھنے تک اور فیچر سے لے کر کالم نگاری تک ہر صنفِ صحافت پر انہیں مکمل عبور تھا۔' ('منّو بھائی کے بعد.....'، جنگ ۲۱ جنوری ۲۰۱۸)۔

منّو بھائی کی تخلیقی زندگی کا ایک پہلو اُن کی ڈرامہ نگاری بھی تھا۔ انہوں نے ٹیلی ویژن کے لیے بعض مقبولِ عام سیریل لکھے۔ 'سونا چاندی' ان میں سے ایک تھا۔ اس میں دو سادہ لوح میاں بیوی جو ایک گھر میں ملازم تھے ایک دوسرے کے ساتھ نوک جھونک میں مصروف نظر آتے تھے لیکن ان میں باہمی محبت بھی بہت تھی جو وقتاً فوقتاً اپنا اظہار کرتی تھی۔ ساتھ ہی غریب طبقے کی نفسیات، اُس کی چالاکیوں سے پاک سادہ سوچ، دکھ درد کا جذبہ اور پھر چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں سے خوش ہو جانا۔ یہ سب چیزیں سیریل کی قسطوں میں اُجاگر ہوتی

تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے لکھنے والے نے یہ زندگی خود گذاری ہے یا اس کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ 'سونا چاندی' کے علاوہ انہوں نے 'جھوک سیال'، 'جزیرہ'، 'پلیٹ فارم'، 'پ سے پہاڑ'، 'دشت' اور 'عجائب گھر' جیسے سیریل اور ڈرامے لکھے۔ دیہی معاشرت کو تحریر کرنا اور پھر ڈرامائی شکل میں پیش کرنا ان کا بڑا کامیاب وصف تھا۔ انہوں نے فیوڈل معاشرے کے غیر انسانی رویوں کو بڑی ہوشمندی سے ناظرین تک پہنچایا۔ 'جھوک سیال' کے حوالے سے نامور شاعر اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد کا کہنا ہے کہ:

'میرے ڈرامہ سیریل 'وراث' کو پی ٹی وی میں پاکستانی دیہات اور اُن کے کلچر کے حوالے سے عام طور پر اوّلیت اور ٹرینڈ سینٹر کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس کی ابتدا مجھ سے پہلے منّو بھائی 'جھوک سیال' کی ڈرامائی تشکیل کے حوالے سے نہ صرف کر چکے تھے بلکہ معیاری اعتبار سے بھی وہ سیریل دیہات کے لوکیشن اور کردار نگاری کے حوالے سے کسی سنگ میل سے کم نہیں تھا'۔ ('منّو بھائی'، روزنامہ 'ایکسپریس'، ۲۱ جنوری ۲۰۱۸ء)۔

منّو بھائی کے ڈرامے اور ٹی وی سیریلز عوام کی زندگی کی جھلکیوں اور معاشرے کے بے رحم طبقاتی امتیازات کی تصویر کشی پر مشتمل تھے۔ ایسا کرتے وقت ان کے لہجے اور بیانیے میں حسرت کے بجائے امید کے اور یاس کے بجائے آس کے رنگ زیادہ جلوہ گر رہتے تھے۔ بقول امتیاز عالم:

'منّو بھائی نے ہمیں کبھی حالات کی سفاکیوں کے آگے رونے نہیں دیا۔ وہ ایسی طربیہ پھبتی کستے کہ آزار چھٹ جاتے اور ہم اپنی بے بساطی پر خوب ہنستے۔ زندگی سمجھنے، زندگی سے پیار کرنے اور مقہور و محروم زندگیوں کو بدلنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ وہ کبھی پچھتاوے کا شکار نظر آئے نہ حالات کی قہر سامانیوں پہ پژمردہ! روشن خیالی تو اُن میں اور ان کے ہمنواؤں میں خوب کوٹ کوٹ کر بھری ہی تھی، لیکن پرامیدی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا' ('جو بادہ کش تھے پرانے، وہ اٹھتے جاتے ہیں'، روزنامہ 'جنگ'، ۲۱ جنوری ۲۰۱۸ء)۔

منّو بھائی کا تخلیقی وفور جس طرح ان کے ڈراموں میں جاگزیں ہوا اُس پر بھی امتیاز عالم نے بہت خوبصورت اور مناسب ترین تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

'یہ اُن کا انقلابی مجاہدہ ہی تھا جس نے پاکستان کی تاریخ کے ہر موڑ پر انہیں حق و باطل کے معرکے میں سچ اور حق کے ساتھ کھڑا کیے رکھا۔ اُن کی قوتِ گویائی میں لکنت نہ ہوتی تو وہ شاید بہت بڑے فلمی کیرکٹر ایکٹر یا پھر چارلی چپلن جیسی شخصیت ہوتے۔ انہوں نے قلم تھاما اور پھر اُس کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ کیسے کھیل اور کیسے کیسے کردار انہوں نے گھڑ کر زندۂ جاوید کر دیے..... ان کا پہلا سیریل مکمل ہوا۔ پھر کیا تھا، منّو بھائی میں اظہار کی خوابیدہ تخلیقی قوتیں جیسے ٹھاٹیں مارتی لہروں کی مانند کوند پڑیں۔ اور بس وہ سیریل پر سیریل لکھتے چلے گئے اور معاشرے کے بے نام کرداروں کو انہوں نے جو وجاہت بخشی وہ کم دیکھنے میں آئی' (ایضاً)۔

منّو بھائی کی کالم نگاری اور ڈرامہ نویسی کے علاوہ ایک تیسری پہچان اُن کی شاعری ہے۔ انہوں نے بہت پُر اثر اور ذہن کو جھنجھوڑ ڈالنے والی نظمیں بہت سادہ پیرائے میں لکھی ہیں۔ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ پنجابی میں ہے۔ پنجابی ادب کو بہرحال اس بات پر ناز رہے گا کہ اس کے حصے میں منّو بھائی جیسا علم دوست اور جرأت انکار سے متصف شاعر آیا۔ ان کی پنجابی شاعری میں پنجابی کی لوک شاعری کی فضا بھی ہے اور آج کے پنجاب کے نئے حسّی رجحانات کا واضح پرتو بھی۔ اس میں زندگی کی بنیادی سچائیاں بھی ہیں، بدلتے ہوئے سماج کی کروٹوں کی آواز بھی اور آنے والے زمانوں کے قدموں کی آہٹ بھی۔ اس آہٹ میں امید اور رجائیت کے رنگ بھی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔

منّو بھائی نے اردو میں زیادہ شاعری نہیں کی۔ شعری تخلیقی اظہار کے لیے انہوں نے پنجابی کا ہی انتخاب کیا۔ اُن کی پنجابی نظمیں پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی رعنائی خیال کو پنجابی کی نظموں میں آراستہ کرتے تھے، شاید غیر مادری زبان میں وہ یہ کام اس خوش اسلوبی سے نہ کر پاتے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اگر شاعری کی تخلیق تحصیلِ ذات کا ذریعہ ہے تو پھر مادری زبان ہی اس تحصیل اور اظہارِ ذات کا سب سے اچھا اور مؤثر ذریعہ ہو سکتی ہے۔ منّو بھائی نے شاعری کے لیے مادری زبان کا انتخاب کیا تو یقیناً اس کا سبب یہی رہا ہوگا کہ ان کے جو حسّی تجربات تھے، جو محسوسات انہوں نے خارجی دنیا کو برتتے ہوئے داخلی طور پر وضع کیے، اُن کا اظہار وہ اپنی مادری زبان ہی میں بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ ایک گفتگو میں انہوں نے خود ذکر کیا کہ ایک مرتبہ فیض صاحب نے اُن سے پوچھا کہ وہ پنجابی میں شاعری کیوں کرتے ہیں، اردو میں کیوں نہیں کرتے۔ منّو بھائی نے دلچسپ جواب دیا کہ اردو شاعری 'بحر' میں ہوتی ہے جبکہ پنجابی شاعری 'لہر' میں ہوتی ہے۔ بات دلچسپ ہی نہیں فکر انگیز بھی ہے۔ ہم کہیں تو

شاید یوں کہہ سکتے ہیں کہ بحر تو شاعری کی فنی ضرورت ہے ہی، سو اس کو تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن 'لہر' جس کو ہم بے ساختگی کہہ سکتے ہیں، ترنگ کہہ سکتے ہیں، وہ چیز ہے جو اپنی زبان سے، مادری زبان سے، آتی ہے، اُس کلچر سے آتی ہے جس میں انسان کی کمسنی اور بچپن گزرا ہوتا ہے۔ مذکورہ گفتگو میں خود فیض صاحب نے ایک بات کہی جو اس لہر کے انسان کی فطرت میں داخل ہو جانے کی توثیق کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسان کو شاعری اُس زبان میں کرنی چاہیے جس میں وہ خواب دیکھتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات بتائیں گے کہ خواب انسان اُس زبان میں دیکھتا ہے جس میں اُس نے ابتداً سننا اور بولنا شروع کیا ہوتا ہے، جو اس کے گھٹی میں بیٹھ چکی ہوتی ہے اور جو اس کے دماغ کے خلیوں میں داخل ہو گئی ہوتی ہے۔ جب دماغ کے یہ خلیے خواب کی صورت میں خیالوں اور تصویروں کا اظہار کرتے ہیں تو ان خلیوں میں محفوظ آوازیں یعنی 'زبان' ہی اس کا وسیلہ بنتی ہے۔

پنجابی میں ان کی کئی نظمیں پڑھنے اور سننے والوں کے دل موہتی رہی ہیں۔ انہی میں ایک نظم 'اوہ وی خوب دیہاڑے سن' تھی۔ انسان کی محرومیوں کی کتنی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ افلاس کون کون سی جُون بدل کر انسان کو گھائل کرتا ہے۔ کیسی پُر اثر نظم ہے:

اوہ وی خوب دیہاڑے سن
بھکھ لگدی سی
منگ لیندے ساں
مل جاندا سی
کھا لیندے ساں
نئیں سی ملدا
تے رو پیندے ساں
روندے روندے سوں رہندے ساں
ایہہ وی خوب دیہاڑے نیں
بھکھ لگدی اے
منگ نئیں سکدے
مل دا اے تے
کھا نئیں سکدے
نئیں مل دا تے
رو نئیں سکدے
نہ رویئے تے سوں نئیں سکدے

ایک اور شعبہ جس میں منّو بھائی کی خدمات قابل ذکر رہیں گی، وہ مختلف زبانوں کی شاعری کے اُن کے کیے ہوئے تراجم ہیں۔ خاص طور سے انہوں نے عالمِ عرب کے بعض معروف شعراء کی منتخب نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ تراجم پر مشتمل اُن کی کتابوں میں 'فلسطین فلسطین'، 'محبت کی ایک سو ایک نظمیں' اور 'انسانی منظر نامہ' شامل ہیں۔ جس زمانے میں فیض صاحب بیروت میں مقیم تھے اور افرو ایشین رائٹرز کے رسالے 'لوٹس' کی ادارت کر رہے تھے، انہوں نے وہاں سے کئی نظمیں منّو بھائی کو ترجمہ کرنے کے لیے بھیجیں۔ مشہور عربی شاعر نزار قبانی بھی ان دنوں بیروت میں تھے۔ چنانچہ منّو بھائی نے ان کی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح محمود درویش کی شاعری بھی اُن کے طفیل اردو میں منتقل ہوئی۔ ہم عصر عربی شاعری کے ان تراجم کے ذریعے اردو پڑھنے والوں کو عالمِ عرب کے سامراج دشمن رجحانات اور وہاں کی مزاحمتی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

مظلوم انسانوں کے لیے منّو بھائی کی دردمندی اور اُن کے لیے ہمیشہ آواز اٹھانا، یہ تو ایک مستقل پہلو تھا ہی، ان کی کالم نگاری اور شاعری کا مگر ایک موضوع جس پر انہوں نے بالخصوص توجہ دی وہ ہمارے معاشرے میں عورت کی مظلومیت ہے۔ اس کہانی کا آغاز اُن کی اپنی ابتدائی زندگی ہی سے ہوتا ہے اور وہ بھی ایک ذاتی تجربہ کی شکل میں نا کہ کسی مطالعے کے نتیجے میں۔ اُن کی زبان میں لکنت اک عرصہ رہی۔ شروع میں یہ زیادہ تھی، بعد میں یہ کم ہوتی گئی۔ انہوں نے خود اس کا سبب ایک افسوسناک واقعہ کو بتایا۔ اُن کا کہنا تھا بچپن میں انہوں نے ایک روز اپنے والد کو، والدہ پر ہاتھ اُٹھاتے دیکھ لیا۔ اس شدید صدمے کا اثر ان کی زبان میں لکنت کی شکل میں ہوا۔ لیکن زبان اور نطق میں در آنے والی رکاوٹ، قلم کے راستے یوں دور ہوئی کہ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو پھر خوب لکھا، بے دریغ لکھا، اور عورت کی بے بسی کے حوالے سے لکھا..... رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔

عورت، منّو بھائی کے لیے مظلومیت کا استعارہ ہی نہیں تھی بلکہ انہوں نے اس موضوع پر اس کے تاریخی اور تہذیبی زاویوں سے غور کیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک فیمی نِسٹ تھے، بلکہ یہ زاویہ ان کی فکر اور شخصیت میں، تخلیقی زندگی کے اوائل ہی میں مستحکم ہو گیا تھا۔ کس طرح بہت سامنے کے واقعات سے وہ گہرے فکری نتائج نکال سکتے تھے، اس کی ایک مثال ان کے ایک انٹرویو میں بیان ہوئی۔ جناب انور سن رائے کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے ایک واقعے کا ذکر کیا۔ یہ ان کی صحافت کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ ایک عورت اخبار کے دفتر

آئی، اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجھ چکی تھیں۔ وہ اپنے چھ، سات سال کے بچے کی گمشدگی کی اطلاع شائع کروانا چاہتی تھی۔ منّو بھائی نے بچے کی تفصیلات پوچھیں۔ اس کی عمر کیا تھی۔ کپڑے کیسے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ نیلے رنگ کی قمیض تھی، ہوائی چپل اس کے پیروں میں تھی۔ منو بھائی نے شلوار کا رنگ پوچھا تو عورت نے بتایا، وہ سفید تھی مگر اب تو میلی ہوگئی ہوگی۔ بس اس آخری بات نے منّو بھائی کو سوچ میں ڈال دیا۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بات کہ بچے کی شلوار اب میلی ہوگئی ہوگی، صرف ایک ماں ہی کہہ سکتی ہے۔ باپ رپورٹ درج کرواتا تو زیادہ سے زیادہ شلوار کا رنگ بتاتا، مگر یہ ایک ماں ہی کا تجربہ تھا کہ بچوں کے کپڑے کب میلے ہوتے ہیں۔ کب دُھلتے ہیں۔ ماں کا تعلق اولاد کے ساتھ اتنی تفصیل کا حامل ہوتا ہے، اتنی قربت اور گہرائی اس رشتے میں ہوتی ہے۔ بس یہیں سے اُن کے ذہن میں یہ نکتہ سمایا کہ باپ کی نظر اور ماں کی نظر میں کتنا فرق ہوسکتا ہے۔ عورت کی نظر سے چیزوں کو دیکھو تو وہ مرد کی نظر سے دیکھی ہوئی چیزوں سے مختلف ہوگی (منّو بھائی کا انور سن رائے کو انٹرویو۔ روزنامہ '۹۲ نیوز'، ۲۵ جنوری ۲۰۱۸ء)۔ خود منّو بھائی نے دنیا کو عورت کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی، اور پھر یہی ان کی مستقل روش بن گئی۔

عورت کی سوچ کا انداز کیا ہے؟ اس بارے میں منّو بھائی اپنے کسی ملنے والے کی بات کا ذکر کرتے تھے۔ منّو بھائی نے یہ سوال اُن سے کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ بڑا فرق ہے مرد اور عورت کے سوچنے کے انداز میں۔ مرد کے لیے جو ایک ہفتہ ہوتا ہے، عورت کے لیے وہ سات دن ہوتے ہیں، مرد کے لیے مہینہ ہوتا ہے، اس کے لیے تیس دن ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ایک دن ہوتا ہے، عورت کے لیے چار پہر ہوتے ہیں۔ عورت کو ایک ایک دن، ایک ایک پہر کی زندگی گذارنی ہوتی ہے۔ وہ لمحہ لمحہ جیتی ہے۔ زندگی کو وہ گذارتی ہے، بسر کرتی ہے۔

پھر وہ اس فیمی نزم سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں اور اب ایک اشتراکی کی حیثیت سے بات کرتے ہیں۔ اب ان کا کہنا ہوتا ہے کہ دنیا کو دیکھنے کی ایک مظلوم کی نظر ہوتی ہے اور ایک ظالم کی۔ کمزور دنیا کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، طاقت ور اسی دنیا کو ایک دوسری نظر سے دیکھتا ہے۔ جب تک ہم مظلوم اور کمزور کی نظر سے چیزوں کو نہیں دیکھیں گے، معاشرے کے تضاد ہمارے سامنے نہیں آئیں گے۔ نظام کی بے مہری ہماری نظروں سے اوجھل رہے گی اور یوں ہم ظلم کے نظام کو برداشت کرتے رہیں گے، اس کے خلاف اٹھنے کی خُو ہم میں پیدا نہیں ہوگی۔

منّو بھائی کی فکری جہات جن کا اظہار ان کی شاعری، کالم نگاری اور دوسری تخلیقات میں ہوا، ان کی شخصیت اور کردار کا ایک وسیع اور بھرپور موضوع ہے۔ لیکن ان کی داستان حیات کا چھوٹے سے چھوٹا جائزہ بھی ان کی اُن عملی کاوشوں سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا جو انہوں نے اپنے نظریاتی آدرشوں کو روبہ کار دیکھنے کے لیے کیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انہوں نے آزادیٔ صحافت کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ شہری آزادیوں کے علمبردار کی حیثیت سے انہوں نے بحالیٔ جمہوریت کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریکِ بحالیٔ جمہوریت میں حصہ لینے پر ڈاکٹر انور سجاد، شوکت صدیقی اور فخر زمان کی طرح منّو بھائی پر بھی ٹیلی ویژن کے دروازے بند کردیے گئے۔

منّو بھائی رفاہی کاموں کی طرف بھی آئے۔ تھیلی سیمیا کے بچوں کے علاج معالجے کے لیے انہوں نے ایک بچی کے نام پر 'سندس فاؤنڈیشن' کی بنیاد رکھی۔ اس فاؤنڈیشن میں تھیلے سیمیا اور بلڈ کینسر کے مریض بچوں کا علاج ہوتا ہے۔ منّو بھائی اپنا بہت سا وقت اس فاؤنڈیشن کو دیتے۔

وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے، ان کی دلجوئی کرتے، وہ ان کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتے۔ اسی سندس فاؤنڈیشن کو انہوں نے اپنی آخری زندگی میں اپنا ایک ورثہ قرار دیا۔ خدمت خلق کو ایک مقدس اور عظیم خدمت تصور کرنے کے علاوہ وہ اس کو خود انسان کی اپنی تحصیلِ ذات کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اپنی ایک آخری تحریر میں انہوں نے لکھا:

> 'زندگی کی دو دھائیاں مریضوں کی خدمت کر کے محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دنیا میں سکون اور آخرت میں جنت کا سودا کیا ہے۔ تنہائی تو محض ایک وہم ہے انسان کا، ورنہ رشتے ناطے ہر وقت ہمارے اردگرد ہی تو ہیں۔ دل کی آنکھ سے دیکھو تو کوئی پرایا نہیں، سب ہی تو اپنے ہیں کیونکہ دل میں خلوص ہو تو سبھی رشتے زندہ ہیں ورنہ موت انسان کے مرنے سے نہیں بلکہ احساس کے مرنے سے ہوتی ہے۔ بس اسی احساس کو ہم سب نے مل کر زندہ رکھنا ہے۔' ('میرا آخری کالم اور وارثت'، روزنامہ 'جرأت'، لاہور ۲۲ جنوری ۲۰۱۸)۔

منّو بھائی ایک طویل اور صبر آزما قلمی جدوجہد اور پرخلوص رفاہی خدمات کے بعد اب ہمارے درمیان سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مگر نہ تو ان کی تحریریں اور نا ہی ان کا فلاحی اور رفاہی کام کبھی بھلایا جاسکے گا۔ وہ موت جو مرنے والے کی کہانی کو ختم نہیں کرتی بلکہ اُس کو جاوداں بنا دیتی ہے، اُسی کے بارے میں تو بھلّے شاہ کہ گئے ہیں کہ بھلّے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور۔

اکیسویں صدی کا سوشلزم

اثر امام

بظاہر تو یہ ایک معمولی سوال ہی ہے کہ اکیسویں صدی کا سوشلزم لکھنا چاہیے یا اکیسویں صدی میں سوشلزم ٹھیک رہے گا لیکن فی الحقیقت ''کا'' اور ''میں'' کے محض ایک لفظ ہی سے جملے کا مفہوم مکمل طور پر بدل جاتا ہے وہ اس طرح کہ اگر آپ اس خیال کے حامی ہیں کہ اکیسویں صدی کا سوشلزم کہنا درست ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ماضی کے تمام تجربات سے علیحدہ ہر صدی کا اپنا الگ سوشلزم ہوتا ہے لیکن اگر آپ اس خیال کو درست سمجھتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں سوشلزم کہنا مناسب ہے تو پھر آپ یوں سمجھیے کہ بنیادی اصولوں پر کسی بھی قسم کی سودے بازی کیے بغیر ہر دور اور ہر خطے کی مخصوص صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے سوشلسٹ انقلاب کرنا درست طریق کار ہے۔

اکیسویں صدی کا سوشلزم کوئی نئی نظریاتی ایجاد ہے یا یہ پرانی بوتل میں نئی شراب کا معاملہ ہے اکیسویں صدی کا سوشلزم اپنا اظہار کس طرح کرے گا؟ یہ سوالات بھی قابل غور ہیں۔ اکیسویں صدی کے سوشلزم کا نظریہ پہلی مرتبہ جرمنی کے ماہر سماجیات ہینس ٹیٹرخ سٹیفن نے ۱۹۹۶ء میں پیش کیا تھا یہ صاحب ۱۹۷۷ء سے میکسیکو میں تعلیم و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے ہیں بعد میں ہیوگوشاویز کے مشیر بھی بنے۔ اکیسویں صدی کے سوشلزم کا نظریہ سوویت یونین اور مشرقی یورپی ممالک میں سوشلسٹ حکومتوں کے خاتمے کے بعد ظاہر ہوا اکیسویں صدی کے سوشلزم کی نظریاتی عمارت اس بنا پر تعمیر کی گئی تھی کہ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں ہی انسانوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ سوویت یونین نے انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ کرتے ہوئے انسانیت کی بہتری کی خاطر بہت سی کامیابیاں حاصل کی تھیں چنانچہ یہ کہنا کہ لوگوں کے مسائل حل کرنے میں سوشلزم بھی ناکام رہا جس طرح سرمایہ داری دراصل بیسویں صدی میں سوشلزم کے تجربات اور سوویت یونین کی تمام حاصلات سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ لہذا کوئی مانے یا نہ مانے ٹیٹرخ کے اس نظریے کا ایک لازمی نتیجہ بیسویں صدی کے تمام سوشلسٹ تجربات اور ان کی کامیابیوں کے انکار کی صورت میں سامنے آیا ہے ٹیٹرخ کا خیال تھا کہ اب لبرل جمہوریت کا زمانہ ہے سرمایہ داری اور تاریخی پرولتاری طبقے کی حکمرانی کا زمانہ گیا ٹیٹرخ کے اس اکیسویں صدی کے سوشلزم کی معیشت کا نظام خلط ملط قسم کا ہوگا جس میں بیک وقت ملکیت کی تین مختلف اشکال موجود ہوں گی سماجی ملکیت بھی ہوگی کوآپریٹو بھی اور نجی املاک بھی موجود ہوں گی اور ہوگا پھر بھی یہ ایک سوشلزم ہی۔ بہت خوب۔ ٹیٹرخ صاحب مارکس کا نقاب اوڑھے رہنے کی کوشش میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس سوشلزم میں برتری سماجی ملکیت کو حاصل ہوگی محنت اور قدر کے قوانین کے حوالے سے مارکس ازم کی پیروی کی جائے گی پیداشدہ دولت کو جمہوری انداز میں تمام پیداوار کنندگان میں مساوات کی بنا پر تقسیم کیا جائے گا اس نظام میں سرمایہ دارانہ منڈی کے قوانین لاگو نہیں ہوں گے تاہم ٹیٹرخ صاحب کی طرف سے فراہم کردہ تمام ضمانتوں کے باوجود سچ یہ ہے کہ خلط ملط معیشت والا کوئی سوشلزم نہیں ہوتا اور نہ سوشلزم اور سرمایہ درانہ منڈی کے قوانین کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کسی بھی ملک میں سوشلزم یا تو ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک عبوری عہد ہوتا ہے جس طرح نئی اقتصادی پالیسی کے برسوں میں لینن کے روس یا ہمارے زمانے کے چین میں بقول ان کے سوشلزم کی تعمیر کا کام جاری ہے کیونکہ سوشلزم محض ایک فرمان جاری کرنے یا سیاسی اقتدار اپنے قبضے میں لے لینے سے تو نافذ نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی تعمیر کرنی پڑتی ہے اس صورت میں تو یہ بات تسلیم کرنا معقول ہے کہ چلیں ابھی چونکہ عبوری عہد سے گزر رہے ہیں اس لیے تھوڑا سا چلنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں اپنی فطرت اور ماہیہ میں ہی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سوشلزم کی تعمیر کا یہ عبوری عہد کتنے عرصے تک جاری رہے گا اس کی کوئی واضح حد بندی نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کا دارومدار تو کسی خاص ملک کی اندرونی و بیرونی صورت حال پر ہوتا ہے کہ وہ

کتنے وقت میں سوشلزم کی تعمیر کرلیتا ہے لیکن ایک بار جب آپ یہ طے کرلیتے ہیں کہ آپ نے اپنے ملک میں سوشلزم قائم کرلیا ہے تو اس کے بعد یہ گنجائش نہیں نکالی جاسکتی کہ وہاں نجی ملکیت اور سرمایہ دارانہ منڈی کے قوانین بھی نافذ ہوں۔ اس معنی میں ہم یہ کہتے ہیں کہ موجودہ چین جو کہ ابھی تک اپنے آپ کو عوامی جمہوری چین ہی کہہ رہا ہے سوشلسٹ چین نہیں اس نے اپنے ملک میں جس طرح نجی اور کارپوریٹ سرمائے کو چھوٹ دے رکھی ہے زیادہ لمبے عرصے تک یہ نہیں ہوسکتا کہ چین میں نہ سوشلزم قائم ہوسکے اور نہ سرمایہ داراری کی مکمل فتح ہو لازماً ان دونوں میں سے کسی ایک کی حتمی فتح ہونی ہے۔

اکیسویں صدی کا سوشلزم اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سرمایہ داری کی سوشل ڈیموکریٹک شکل کو بائیں بازو کے نقاب میں چھپالیا جائے اس طرح کے تجربات بالخصوص لاطینی امریکہ کے ممالک میں کیے گئے ہیں ہیوگر شاویز کی مثال اس سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے جنہوں نے امریکہ مخالف تقریروں میں جوش خطابت تو خوب دکھایا لیکن جب باری آئی اپنے ملک کے اندر ملکیتی نظام میں کوئی واضح اور بنیادی تبدیلی لانے کی تو ان کی کوئی خاص کارکردگی نظر نہیں آئی۔

ہمارے ملک کے اندر بھی کچھ نام نہاد مارکسی دانشور موجود ہیں جو اکیسویں صدی کے سوشلزم سے بہت زیادہ متاثر ہیں جن میں سے کچھ تو برملا یہ بات کررہے ہیں کہ بیسویں صدی کے تجربات سے بنیادی طور پر مختلف اکیسویں صدی کا سوشلزم ایک قطعی طور پر مختلف چیز ہوگا اس طرح کے دانشور ہمارے زمانے اور معاشرے میں جاگیردارانہ نظام تو درکنار جاگیری باقیات تک کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کے اس انکا کا لازمی نتیجہ کسانوں' کسان تحریکوں اور کسان کمیٹیوں کی تشکیل کے سارے امکانات کے انکار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ علاوہ ازیں دیہی علاقوں میں موٹر سائیکل کا پنکچر بن جانے کی مثال پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اب شہری علاقوں اور دیہی علاقوں کے بیچ کی تفریق بھی مٹ چکی ہے نتیجتاً دیہی علاقوں کے مسائل پر الگ سے کوئی تحریک چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جارہی دوسری جانب روایتی صنعتی مزدور یا جسے مارکس ازم نے پرولتاریہ کے نام سے بیان کیا تھا کے وجود سے انکار کیا جارہا ہے صنعتی مزدور موجود ہی نہیں صنعتی مزدور بہت کم تعداد میں موجود ہیں یا صنعتی مزدور ٹریڈ یونینوں میں منظم نہیں ہے جیسے عذر پیش کرکے پہلے بالواسطہ لیکن اب تو براہ راست تحریر و تقریر کے ذریعے اس بات کی وکالت کی جارہی ہے کہ پرولتاریہ کے بل بوتے پر کوئی انقلاب نہیں کیا جاسکے گا ہمیں پرولتاریہ کی طرف دیکھنے اور اس کو منظم کرنے کی جدوجہد کرنے کے بجائے اس کے متبادل کو ڈھونڈنا اور اسے منظم کرنا پڑے گا اس طرح کی فکر کا اس کے علاوہ اور کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے کہ ہمارا زمانہ طبقات اور طبقاتی جدوجہد کا زمانہ نہیں رہا اس کے برعکس ہمارا زمانہ تحریکوں کا زمانہ ہے پاپولر تحریکیں جہاں اور جس حال میں بھی موجود ہیں ان کا حصہ بن جایئے نظریات اور بنیادی تبدیلیوں کے لیے جدوجہد کرنے کی بجائے اشوز پر سیاست کیجیے اگر معاملہ ابھرا ہوا ہو کچی آبادیوں اور بحریہ ٹاؤن کا تو اس کے چیمپین بن جایئے اگر معاملہ چل رہا ہے قصور کی معصوم بچی زینب کا تو اس پر سیاست کیجیے اور پھر اس کے بعد نقیب محسود او رراؤ انوار کے اشو پر بیان بازی کیجیے اس بیچ اگر گنے کے کاشت کار اور کسان و مزدور مناسب نرخ نہ ملنے کی بنا پر فاقہ کشی پر مجبور ہیں گنے کو پھونک رہے ہیں تو ان کی بلا سے ہمارا کیا لاکھوں کسانوں کے ساتھ کھڑے ہوکر کسی مضبوط کسان تحریک کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کرنے کے بجائے سوشل میڈیا پر ابھرے ہوئے کسی ادنی سے معاملے پر سرگرم ہوجایئے اور اپنی معمولی سرگرمی کو بھی لال قلعہ فتح کرنے کے مترادف بتایئے خود لکھیں' خود ہی پڑھیں' خود ہی فیس بک پر پوسٹ کریں اور خود ہی اسے لائیک اور شیئر کریں اپنے دوستوں اور دوستوں کی جعلی آئی ڈیز کے ذریعے اپنی واہ واہ کرایئے اور ایک ہی جھٹکے میں ہیرو بن جایئے۔ زمینی حقائق سے قطع نظر فیس بک اور سوشل میڈیا کے دیگر ذرائع سے اپنے پیروکار اور حمایتی پیدا کریں اور ان کے سہارے اپنی سیاست اور سیاسی پارٹی کھڑی کریں۔ یہی ہے وہ سیاست جو اکیسویں صدی کے نئے سوشلزم کے وکیل کرنا چاہتے ہیں اور کررہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اکیسویں صدی کا سوشلزم اور چاہے جو کچھ ہو لیکن سوشلزم ہرگز نہیں ہے کیونکہ سوشلزم ابتدائی مرحلہ ہے کمیونزم کا' کمیونزم تنقید ہے سرمایہ داری کی اور بالعموم استحصال پر مبنی تمام نظاموں کی۔ منطقی بات یہ ہے کہ جب تک استحصال کی کوئی بھی شکل موجود ہے تب تک استحصال پر مبنی تمام نظاموں کی استحصال کی تمام اشکال میں سب سے بنیادی اور بدترین شکل طبقاتی استحصال کی

ہے منطقی بات یہ ہے کہ جب تک استحصال کی کوئی بھی شکل موجود ہے تب تک استحصال کے خلاف جدوجہد بھی لازم ہے جب تک استحصال کرنے والے طبقات موجود ہیں اس وقت تک یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ استحصال کا شکار بننے والے طبقات موجود نہ ہوں لاکھوں ایکڑ زرعی زمین کے مالکان بھی موجود ہیں زرعی اجناس کی پیداوار میں حصہ داری بھی موجود ہے جاگیرداروں کے سیاسی سماجی اور ثقافتی اثر ورسوخ کی صورت میں جاگیردارانہ باقیات بھی موجود ہیں لیکن کسان موجود نہیں ہیں!؟ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سرمایہ دار تو موجود ہیں لیکن مزدور موجود نہیں ہیں!؟ سرمایہ دار تو کثری القومی اور کثیر البراعظمی صورت اختیار کر کے پہلے کے مقابلے میں زیادہ ظالم و جابر بن کر سامنے آیا ہے لیکن مزدور اب بھی اپنی کلاسیکل شکل میں موجود ہو' ہرگز نہیں یقیناً آج کے زمانے میں مزدور بھی نئی شکل وصورت میں وجود رکھتا ہے اب اس کا استحصال اتنی شدت اور پیچیدگی کے ساتھ کیا جارہا ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں ہو پارہا کہ اس کا استحصال کون اور کس طرح کررہا ہے لیکن یہ کہنا کسی بھی طرح درست نہیں ہوگا کہ ہمارے زمانے میں مزدور موجود ہی نہیں یا چونکہ مزدور خود منظم نہیں ہورہے تو ہم بیٹھ کر ان کے منظم ہونے کا انتظار کریں گے کیا؟ (ان دانشوروں کا بڑا محبوب طنزیہ فقرہ ہے ''سرمایہ کاری ہوگی' صنعتیں لگیں گی پرولتاریہ پیدا ہوگا اور پھر سوشلسٹ انقلاب آئے گا۔'' ان کا سوشلزم اور سوشلسٹ انقلاب اس طرح کی کسی بھی صورت حال کا محتاج نہیں ہے) چنانچہ ہمیں ان مزدوروں کو منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو پرولتاریہ کی وصف پر تو پورے نہیں اترتے لیکن ہیں وہ بھی محنت کش ہی گو کہ ہم محنت کشوں کی تمام پرتوں کو منظم کرنے اور اپنی انقلابی جدوجہد کا حصہ بنانے کے حق میں ہیں لیکن اس تنظیم کاری کے عمل میں سب سے اہم اور بنیادی محنت کش طبقات یعنی پرولتاریہ اور کسان کو خارج از امکان قرار دینا ان کی اہمیت کو گھٹا دینا اصل میں اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ کسی بھی ایسی جدوجہد کو منظم نہیں کرنا چاہیے جو اپنے منطقی انجام کو پہنچ سکتی ہو جو نظام کی تبدیلی کی بنیاد بن سکتی ہو کیونکہ یہ ایک مشکل ہدف اور پر خار راستہ ہوتا ہے لہذا پرولتاریہ اور کسانوں کی تنظیم بنانے کے بجائے وائیٹ کالر اور درمیانے طبقے پر توجہ مبذول کرتے ہوئے لبرل ازم کی تائید وتوثیق کی جارہی ہے یہی ہے اکیسویں صدی کا سوشلزم۔

ایمنسٹی اسکیم اور پی آئی اے کی نجکاری

نجم الحسن عطا

دیوار برلن کے گرنے کے بعد مغرب کے سرمایہ داروں نے سوچا کہ اب سرد جنگ اور سابق سویت یونین کا خاتمہ ہوگیا ہے جس کے باوصف استحصال کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور ہوگئیں اور اب سرمایہ دار اپنی مرضی کا امن قائم کریں گے لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ دہشت گردی اور سامراج کی پیدا کردہ عالمی منڈی اور اسلحہ کی فروخت شدہ ہتھیاروں سے دنیا عالمی جنگ سے بھی زیادہ خون آلود ہونے لگی سوشلزم کے انہدام سے دو سال پہلے نیو ورلڈ آرڈر کے بارے میں بڑے تجزیہ نگاروں نے بھی نتائج اخذ کیے اور اقوام عالم کو بتایا کہ دنیا بہت بڑے استحصال اور معاشی زوال کی طرف گامزن ہے جہاں ملازموں کو اب جدید غلامی کا سامنا کرنا پڑے گا نہ کوئی پنشن' نہ گریجویٹی نہ مزید کوئی آسانی یا آسانیاں جو سوشلزم کے دور میں خوف کے مارے غیر سوشلسٹ ملکوں کے محنت کشوں کو ملتی تھیں اب جدوجہد کے باوجود دستیاب نہیں ہیں قانون اور سیاست کے پرچارک بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں مغرب کے معاشی دانشور جیریمی رفکن جنہوں نے اپنی کتاب دی نیو کلچر آف ہائپر کیپٹل ازم میں گلوبلائزیشن کے جدید عمل کو سامراج کی گہری سازش قرار دیا انہوں نے اعداد وشمار اور دلائل سے اس دعوی کو ثابت بھی کیا ان کی کتاب اور بائیں بازو کے مشاہدات کے مطابق یہ امر آشکار ہوگیا کہ ۱۹۸۰ء سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام اور سامراج نہ ہائپر تھا اور نہ کلچرل تھا کیونکہ وہ بیرونی دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک کی مقامی تاریخ وتمدن ان کی ثقافتی اقدار' ان کی روایات ان کے فنون لطیفہ' ان کے نظام تعلیم کی نشو ونما کو روکنے اور ختم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اب اس نے ٹھان لی کہ مقروض اور جاہل لیڈرشپ والے ممالک کے نوجوانوں کا ذوق وذائقہ تبدیل کیا جائے تعلیم کو فروخت کر کے ان کی ثقافت کو روندا جائے غریب پڑھنے کی مالی صلاحیت نہ رکھے اور بے راہ رو ہو کر جرائم کی طرف بڑھے۔ ان کے اثاثوں کو خریدا جائے ایسی فلمیں اور موسیقی سے نوجوانوں کو راغب کیا جائے جس سے ان کی سوجھ بوجھ کو زنگ لگ جائے اور وہ فاسٹ فوڈ کے رسیا ہوجائیں کریڈٹ کارڈ اور کریڈٹ (پرسنل لون) سے رومانس میں اضافہ ہو ٹیکس چوروں کے لیے پرچون کلچر کو کنزیومر

ازم کا لبادہ پہنا کر بچت سے زیادہ تصرف کی طرف لوگوں کو دھکیلا جائے ایک مصنوعی زندگی کی چمک ایک طرف ہو اور دوسری جانب اجاڑ اور ویرانی' آلودگی' بیروزگاری' کچی آبادیاں' بیماریاں' مہنگائی جرائم کی دنیا کا فروغ' جنسی ہیجان ہو اور قتل عام کی فلموں کے ذریعے نوجوانوں کو ترغیب دی جائے تاکہ دنیا روبوٹ بن کر ایک دوسرے کے خون سے کھیلیں۔ حکومتیں مقروض ہوں اپنے بنائے ہوئے اثاثوں کی نجکاری کریں اور ٹیکس چوروں منافع خوروں اور منی لانڈرنگ کرنے والوں کو ایمنسٹی اسکیم کے ذریعے ان کے کالے دھن کو سفید کرنے کی اسکیم کا اجرا کریں اور دیانت داروں کو یہ پیغام دیں کہ غیر قانونی مراعات اور سہولتیں صرف مالداروں کو حاصل ہوں گی ۱۹۸۰ء کے بعد جب امریکی صدر ریگن اور برطانوی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر کو اپنی مخالف طاقت کے تانے بانے میں درجہ اول کے ٹوڈی اور غدار مل گئے جو ملک رہن رکھنے اور فروخت کرنے کو تیار ہیں تو ان کی وساطت سے مقامی زبانوں ثقافتوں اور تاریخ کو انگریزی زبان اور کلچر کے ذریعے ان کی اپنی شناخت دور کرنے کے لیے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنایا اور آزاد منڈی کے مقامی وکیل اور آئی ایم ایف کے ملازمین جو زیادہ تر پاکستان میں وزارت خزانہ کے عہدوں پر براجمان رہے ان کے بارے میں رفکن کی فکر کہتی ہے جس میں نوم چومسکی بھی شامل ہیں کہ مذکورہ مقامی ٹوڈیوں کے ذریعے ریگن تھیچر نظریے جمہوریت اور سیاست کو اقتصادیات اور منڈی کی معیشت متعارف کرا کر عوام کی امور مملکت میں شراکت داری کا خاتمہ کر دیا جائے اور ایسا ہی ہوا اس کے لیے فلم تعلیم شعر و ادب فنون لطیفہ اور تاریخی و مذہبی روایات کو نیا غلط روپ دے کر کاروبار مالیات اور ٹیکنالوجی تک محدود کر دیا جائے سرکاری اداروں کو نجکاری اور تعلیم اور صحت کو کاروباری نیٹ ورک کا حصہ بنا کر عوام سے تحفظات کی چھتری چھین کر انہیں منڈی کی بے رحم قوتوں کے حوالے کر دیا جائے اور سب دیکھ رہے ہیں ان عوامل کا شکار پاکستان کیسے ہوا نہ کوئی رستہ نہ کوئی منزل کا نشان نوم چومسکی ایک جگہ نجکاری کے بارے میں لکھتے ہیں

''نج کاری کا اصولی طریقہ یہ ہے کہ اداروں کو فنڈز کی فراہمی روک دی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ادارے فعال نہ رہیں اور عوام میں بیزاری کا رجحان بڑھتا جائے تاکہ موقع پرست ریاست اسے با آسانی نجی ملکیت کے حوالے کر سکے۔'' دراصل نجکاری عوام کی مملکت کے امور میں شراکت داری کو بیدخل کرنے کا نام ہے اس سے قومی اثاثے عالمی سرمائے میں بہ آسانی منتقل ہو جاتے ہیں اسی لیے پاکستان کی بہترین قومی ایئر لائن جو کسی زمانے میں زبردست ساکھ رکھتی تھی آج اسے زوال پذیر بنا کر نجکاری کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ دانیال عزیز نجکاری کے وزیر نے حال ہی میں ایک بیرونی نیوز ایجنسی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ان کے زیر غور ہے کہ وہ انتخابات سے پہلے پی آئی اے کو نجکاری کے لیے پیش کر دیں اس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ قومی ایئر لائن کی نجکاری کا منصوبہ بنا لیا گیا ہے جس میں اس کے بنیادی بزنس کو دیگر ایئر لائن سے جڑے ہوئے کاروبار سے الگ کرنا شامل ہے اور اس کے دیگر شعبوں کی نجکاری کر دی جائے کچھ برس پہلے اس کی فروخت کو التوا میں رکھ دیا گیا تھا کیونکہ یہ زیادہ نقصان میں تھی وزیر موصوف نے بتایا کہ اس کا خسارہ اس وقت ۳۴۵ ارب روپے تک پہنچ گیا ہے ظاہر ہے گزشتہ تیس برسوں میں ملک کو جس طرح چلایا گیا اور جس طرح ریگن تھیچر کے فارمولے کو عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے عمل میں لایا گیا مقروض ممالک اس منفی عمل سے گریز نہیں کر سکتے اس سے انکار جب کیا جا سکتا ہے کہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جب قومی ایئر لائن اپنے پاؤں پر کھڑی تھی اس کی نجکاری گناہ سمجھی جاتی تھی تاہم مقامی پریس میں جلد بازی کرتے ہوئے دانیال عزیز نے کچھ اس طرح اپنے تاثرات بیان کیے کہ پی آئی اے کا بنیادی بزنس کا تعلق مینجمنٹ اور فلائٹ آپریشن سے ہے اس کی تکمیل پی آئی اے ایکٹ ۱۵ اپریل ۲۰۱۶ء کے مطابق ہوگی انہوں نے کہا کہ نئی کمپنی کیٹرنگ ہوٹل اور مینٹی ننس کو سنبھالے گی اس تناظر میں گزشتہ برس فروری میں شریف انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا پی آئی اے کی فروخت سے پہلے نیویارک میں روز ویلٹ ہوٹل کو فروخت کیا جائے گا ان تمام روٹس کو جو منافع بخش نہیں ان کو بند کر دیا جائے گا جس کے نتیجے میں پی آئی اے 1,50,000 ڈالر کی قیمت چکانی پڑتی ہے اور ایر لائن اس خرچے کو برداشت نہیں کر سکتی مگر یہ نہیں بتایا کہ کس طرح دنیا کی بہترین ایئر لائن اس حالت تک پہنچی ہوا یہ کہ پی آئی اے کی مضبوط ٹریڈ یونین نے زبردست احتجاجی تحریک چلائی اور حکومت مجبور ہوگئی کہ اس کی فروخت کو موخر کر دے نجکاری کی نوبت تب آتی ہے جب معیشت کو قرضوں پر چلایا جائے اور لیے گئے قرضے کو پیداواری شعبوں پر نہ لایا جائے تو پھر معیشت بربادی کے سنگلاخ راستوں پر چل نکلتی ہے اور اس کا عذاب قوم کو

برداشت کرنا پڑتا ہے مسلم لیگ (ن) کی حکومت نے ایک جرمن سی ای او کی تقرری بھی کی تھی وہ پی آئی اے کے ایک جہاز کو مالٹا لے گیا تھا جہاں کسی فلم میں اسے استعمال کر کے اس کے عوض معاوضہ بھی لیا پھر اسے جرمنی لے گیا وہاں اس کے ساتھ کیا ہوا اور جرمن سی ای او کے خلاف حکومت نے کیا کیا وہ سیاسی شور وغل میں دب کر رہ گیا بہت سے سی ای او جو گزشتہ کئی برسوں سے تعینات رہے تقریباً سب پر ہی کرپشن کے مقدمات دائر ہیں لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا بس بدنام وہنے کے لیے یونین اور نچلا عملہ رہ جاتا ہے جسے قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ جو کام نہیں جانتے ان کی بھرتی کو کالعدم قرار دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ پاکستان کی سرکاری کارپوریشن اور بعض نجی ذیلی کارپوریشنز میں نہایت قابل بہترین کارکردگی دکھانے والے کے سر پر زیادہ تنخواہ پر کم تعلیم یافتہ کو مسلط کر دیا جاتا ہے اس طرح میرٹ کی دھجیاں بکھیرنے والے ہی اسی کارپوریٹ کے زوال کے ذمے دار ہوتے ہیں پی آئی اے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ۲۰۱۳ کے عام انتخابات سے پہلے مسلم لیگ ن کے منشور میں نجکاری کا عمل درج تھا جس کے مطابق ۶۸ سرکاری شعبوں کی نجکاری قرار پائی سرکاری ادارے جن میں ریلوے، پاکستان اسٹیل اور پی آئی اے جو ڈیڑھ عشرہ پہلے خسارے میں نہیں تھے آج ۶۰۰ ارب روپے کے خسارے میں ہیں مزید براں جن بجلی کے شعبوں میں نجکاری کی گئی ان سب کے گردشی قرضے بھی ۸۰۰ ارب تک جا پہنچے ہیں اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ ملک گزشتہ کئی برسوں سے چلایا ہی نہیں گیا عوام صرف سیاسی تقریروں میں بیہودہ الفاظ ہی سن رہے ہیں جس میں عوام کی فلاح کا ذکر تک نہیں ہوتا ایک موقر انگریزی اخبار لکھتا ہے کہ ”یہ ہوسکتا ہے کہ شاہد خاقان عباسی جن کا تعلق نجی ائیر لائن ائیر بلو سے ہے اسے ملوث کیا جاتا ہے کہ اس کی مالیاتی کامیابی کیوں نہیں پی آئی اے کی قسمت بدل سکتی۔“ یہ ایک پراسرار راز ہے لیکن جاننے والوں کو علم ہے مگر انتخابات سے پہلے پی آئی اے کی نجکاری آسان کام نہیں ہے اب دیکھیے کہ جوزف اسٹگ گلٹز نوبل انعام یافتہ معیشت دان جو ایک زمانے میں عالمی بینک کے مشیر بھی تھے حال ہی میں وہ کافی بدل گئے ہیں وہ نجکاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف مقروض ملکوں کو نجکاری کی طرف تیزی سے دھکیل رہے ہیں پرائیوٹائزیشن واشنگٹن اتفاق کا ستون ہے، یہ ان ملکوں پر مسلط کی جاتی ہے جو قرضوں کی خواہش رکھتے ہوں“ ادھر یونان کے قابل احترام معیشت دان کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری آخری سانسیں لے رہی ہے لیکن نعم البدل میں عالمی سطح پر کوئی معاشی ماڈل سوشلزم کے اشتراک سے سامنے نہیں آیا جس کی حمایت میں جوزف اسٹگ گائز بہت کچھ کتاب نابرابری کی قیمت میں لکھ چکے ہیں عالمی سطح کے تمام معیشت دانوں کی مشترکہ رائے ہے کہ نجکاری ناکام ہوگئی ہے روس کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ نابرابری بڑھ گئی ہے اور جنی کوئیفی شینٹ Gini Coefficient اتنا ہی برا روس میں ہوگیا جتنا لاطینی امریکہ میں نجکاری کے بعد ہوا اور ان ملکوں کو 1.5 ٹریلین ڈالر کا نقصان ہوا اب سب بربادیوں کا ماخذ کرپشن ہے یہ بھی رائے عالمی معیشت دانوں کی ہے اسی کرپشن کی وجہ سے ٹیکس چوری کے نتیجے میں شاہد خاقان عباسی وزیراعظم پاکستان نے اعلان کیا ہے کہ ایمنسٹی اسکیم کے ذریعے ایک مرتبہ ٹیکس ادا کر کے پاکستان کے بیرونی ممالک میں اثاثوں کو واپس لانے کی کوشش کی جائے گی۔

یاد رہے کہ اس قسم کی اسکیمیں کئی مرتبہ متعارف کرائی گئیں اس میں کم ٹیکس کی ادائیگی پر کالے دھن کو سفید کرنے کی پیش کش کی گئی لیکن یہ اسکیمیں کامیاب نہیں ہوئیں بزنس کونسل نے پاکستان اکنامک فورم کے ذریعے وزیر اعظم کو معاشی حالات کے بارے میں پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں وزیراعظم نے کہا کہ وہ ٹیکس نیٹ کو وسیع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ٹیکس کے نرخوں میں کمی بھی زیر غور ہے تاکہ مالدار اشرافیہ ٹیکس نیٹ میں آئے۔ ایک اندازے کے مطابق ۳۵ لاکھ مالدار کاروباری وصنعتی حلقے انکم ٹیکس ادا نہیں کرتے اگر ان حلقوں کو آمادہ کیا جائے تو بجٹ خسارہ ختم ہوسکتا ہے اور مزید قرضوں سے جان چھوٹ سکتی ہے لیکن اس کے لیے ایکسپورٹ 40 ارب ڈالر یعنی بنگلہ دیش کے برابر لانی پڑے گی وزیراعظم نے خود اس بات پر مایوسی کا اظہار کیا کہ چار ٹریلین روپے کے ریونیو میں مالدار افراد صرف ۲۰۰ ارب روپے انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں (کل چار ہزار ارب روپے بالواسطہ ٹیکس میں ۸۰۰ ارب روپے انکم ٹیکس) وزیر اعظم پاکستان اور نجکاری کے وزیر نے دونوں عوامل کو اس وقت زیر غور رکھا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ سیاسی افراتفری کے درمیان انتخابات کو پانچ ماہ رہ گئے ہیں امید اور خواب دونوں چکنا چور ہوگئے ہیں دیکھیے اس سال کیا ہوتا ہے غالب نے کہا کہ اک برہمن نے کہا کہ یہ سال اچھا ہے۔ ہمارے نجومی کہتے ہیں کہ یہ سال اچھا ہے یہ بھی دیکھیے کہ ہماری تنگ نظری طوطے کی فال تک جا پہنچی ہے۔

طلبہ کے ساتھ ناروا سلوک

ڈاکٹر توصیف احمد خان

پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی جمیعت طلبہ اور بلوچ اور پختون طلبہ کے درمیان جھگڑا ہوا لاہور میں زیر تعلیم پختون اور بلوچ طلبہ نے اپنے ساتھی طلبہ کے ساتھ یکجہتی کے لیے لاہور پریس کلب کے سامنے مظاہرے میں حصہ لیا تیس کے قریب طالبعلموں کو گرفتار بھی کیا گیا ان پر دہشت گردی کی دفعات بھی لگائی گئیں انسانی حقوق کی تنظیموں ترقی پسند طلبہ نے اس صورتحال پر احتجاج کیا۔ حسین نقی اور عاصمہ جہانگیر نے آواز بلند کی۔ بلوچستان کے وزیر داخلہ لاہور آئے اور یوں یہ دفعات ختم ہوئیں اور طلبا کو ضمانت پر رہائی ملی۔ پنجاب یونیورسٹی سمیت ملک کی پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں میں طلبہ تنظیموں کے درمیان جھگڑے فساد ایک معمول کی بات ہے پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت کی اجارہ داری کی تاریخ خاصی قدیم ہے عمومی طور پر جب تعلیمی اداروں میں اس طرح کے تصادم ہوتے ہیں تو انتظامیہ مداخلت کرتی ہے انتظامیہ کی درخواست پر پولیس آتی ہے یہ پولیس والے عموماً دونوں طرف کے طالب علموں کو گرفتار کرتے ہیں اگر تصادم میں آہنی اسلحہ استعمال نہ ہوا ہو یا کوئی طالب علم ہلاک یا شدید زخمی نہیں ہوا ہو تو دونوں طرف کے طلبہ کو ذاتی مچلکوں اور تنبیہہ کے بعد رہا کر دیا جاتا ہے یوں اگر کوئی فرد ہلاک ہو جائے تو علیحدہ ایف آئی آر درج ہوتی ہے اور قانون کے مطابق عمل ہوتا ہے عام طور پر یونیورسٹی کی ڈسپلن کمیٹی متحرک ہوتی ہے ہنگامہ کرنے والے طلبہ کو ڈسلپن کمیٹی کے اظہار وجوہ کے نوٹس کا سامنا کرنا پڑتا ہے ڈسپلن کمیٹی معروضی صورت حال کے مطابق فیصلے کرتی ہے۔

ایک اخبار میں شائع ہونے والی خبر میں الزام لگایا گیا ہے کہ بلوچ طلبہ ایک ترانہ گا رہے تھے جس میں بلوچستان کی آزادی کا ذکر تھا بلوچی زبان اور کلچر سے عدم واقفیت نے صورت حال کو خراب کر دیا بلوچوں کا یہ ترانہ وہاں ایک قومی ترانے کی حیثیت رکھتا ہے یہ بلوچی ترانہ ایوب دور میں بلوچ سردار نوروز خان اور اس کے بیٹوں کو پھانسی دینے کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ اس ترانے میں میر چاکر خان کا ذکر ہے میر چاکر اعظم رند بلوچ نے شیر شاہ سوری کے خلاف فتح حاصل کرنے میں مغل بادشاہ ہمایوں کا ساتھ دیا تھا اور اس طرح شہسوار بلوچ نے ایرانیوں کے خلاف جنگ لڑی اور میر حمل ہوت نے پرتگالیوں کے خلاف جنگ کی یہ سب بلوچ ہیرو تھے۔ جب نواب نوروز خان کو پھانسی دی گئی تو استاد عبدالمجید گوادری نے ترانہ تحریر کیا جو ہر بلوچ اپنے پروگراموں اور جشنوں میں پڑھتا ہے۔ یہ بلوچوں کے لیے لب پہ آتی ہے دعا کی طرح ہے اس ترانے کا عنوان ہے ''ماچکیں بلوچانی' ماچکیں بلوچانی'' جس کے معنی ہم بلوچوں کے اولاد ہیں ہم بلوچوں کی اولاد ہیں۔

بلوچستان گزشتہ ۱۷ سال سے خانہ جنگی کی صورت حال کا شکار ہے۔ نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت کے بعد بلوچ عوام میں عمومی طور پر اور نوجوانوں میں شدید احساس محرومی پیدا ہوا بلوچ طلبہ کی تنظیم بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن نے ایک احتجاجی مہم شروع کی۔ مقتدرہ نے طاقت سے اس مہم کو کچلنے کی کوشش کی کوئٹہ اور پھر کراچی سے بلوچ طلبہ لاپتہ ہوئے جب ڈاکٹر اللہ نذر اور ان کے ساتھیوں نے کراچی پریس کلب کے سامنے بھوک ہڑتال کی تو اس بھوک ہڑتال میں شرکت کرنے والے طلبہ کو نامعلوم افراد اٹھا کر لے گئے۔ بلوچستان میں دیگر صوبوں سے آکر آباد ہونے والے ڈاکٹر' اساتذہ' صحافیوں وکلاء سرکاری ملازمین پولیس افسران حتیٰ کہ خواتین بھی ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہوئے یوں بہت سے اساتذہ ڈاکٹر اور سرکاری ملازمین بلوچستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے پھر بلوچستان میں تعلیم اور صحت کا شعبہ شدید متاثر ہوا اس کے ساتھ ہی لاپتہ ہونے والے سیاسی کارکنوں کی مسخ شدہ لاشیں ملنے لگیں یوں لاپتہ کارکنوں کے لاپتہ ہونے اور مسخ شدہ لاشیں ملنے کا سلسلہ پہلے قومی سطح پر اجاگر ہوا اور پھر یہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا۔ جنیوا میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل کے ایجنڈے میں یہ معاملہ شامل ہو گیا اقوام متحدہ نے اپنا فیکٹ فائنڈنگ مشن پاکستان بھیج دیا اس وقت کے صدر آصف زرداری اور یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم تھے میمو گیٹ اسکینڈل کی بنا پر پیپلز پارٹی کی حکومت سخت دباؤ میں تھی وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے اقوام متحدہ کے مشن سے تعاون نہیں کیا مگر لاپتہ افراد کے لواحقین اور انسانی حقوق کے کارکن مشن کے سامنے پیش ہوئے پھر اس مشن کی ایک منفی رپورٹ اقوام متحدہ کی حقوق کونسل کے ایجنڈے میں شامل ہوئی اس صورت حال میں پاکستان کا امیج متاثر ہوا جب پاکستانی وفد نے مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کا مسئلہ اٹھایا تو بھارتی مندوب اس رپورٹ کا حوالہ دینے لگے

بلوچستان میں ۲۰۰۸ میں پیپلز پارٹی نے حکومت بنائی نواب اسلم رئیسانی

وزیراعلیٰ بنے تو وہ بلوچستان کے حالات قابو نہ کر سکے ہزارہ برادری کی ٹارگٹ کلنگ فرقہ وارانہ بنیادوں پر قتل اغوا برائے تاوان سیاسی کارکنوں کے اغوا اور مسخ شدہ لاشیں ملنے کا سلسلہ جاری رہا جب ۲۰۱۳ میں نیشنل پارٹی کے ڈاکٹر عبدالمالک وزیراعلیٰ بنے تو انہوں نے بلوچستان کے حالات بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے ڈاکٹر مالک منحرف بلوچ رہنماؤں کو ملک واپسی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے انہوں نے ایک قبائلی لشکر کے خاتمے کی جدوجہد کی یہ لشکر ہزارہ منگول برادری کی نسل کشی، فرقہ وارانہ حملوں اور سیاسی کارکنوں کے اغوا اور مسخ شدہ لاشوں کے معاملے میں ملوث بتایا جاتا تھا صوبے میں امن وامان کی صورت حال بہتر ہوئی اسی زمانے میں پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف نے پنجاب کی یونیورسٹیوں میں بلوچستان کے طالب علموں کی نشستوں میں خاصا اضافہ کیا انہوں نے بلوچ طلبہ کو وزیراعلیٰ ہاؤس میں خوش آمدید کہا اور اعلان کیا اس پسماندہ صوبے کے طلبہ کو مزید مراعات دی جائیں گی اس پیشکش سے خاصی طلبہ نے فائدہ اٹھایا بلوچستان میں سیاسی کارکنوں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو سمجھتی ہے کہ بلوچ نوجوانوں کو ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت حقوق حاصل کرنے کے لیے پرامن جدوجہد کرنی چاہیے سردار اختر مینگل حاصل بزنجو اور ڈاکٹر عبدالمالک وغیرہ نے ہمیشہ قوم پرست سیاست کی ہے ان کے بزرگوں نے بلوچوں کے حقوق کے لیے قربانیاں دی ہیں اگرچہ اختر مینگل اور حاصل بزنجو اور ڈاکٹر عبدالمالک کا علیحدہ علیحدہ جماعتوں سے تعلق ہے مگر یہ رہنما انتخابی سیاست پر یقین رکھتے ہیں اختر مینگل نے اپنے آبائی علاقے وڈھ میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے زمین عطیے کے طور پر دی ہے وزیر داخلہ احسن اقبال نے گزشتہ دنوں اس سرکاری یونیورسٹی کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا ہے یہ رہنما سمجھتے ہیں کہ بلوچ نوجوانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنی چاہیے یوں بلوچ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دیگر صوبوں میں قیام پذیر ہے ان طلبہ نے بندوقوں کے راستے کو مسترد کیا ہے اور تعلیم کا راستہ اختیار کیا ہے ان کو تھانوں میں بند کرنے اور تشدد کا نشانہ بنانے سے صورت حال خراب ہوگی اب تو پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ اور سابق وزیراعظم میاں نواز شریف بھی کہتے ہیں کہ انہیں شیخ مجیب الرحمٰن بننے پر مجبور نہ کیا جائے یہ بات ان بلوچ اور پختون طلبہ پر صادق آتی ہے ہم سب کو میاں نواز شریف کی بات سے ہی سبق حاصل کرنا چاہیے۔

☆.....☆

عمران خان کی لعنت پارلیمنٹ پر ہے یا عوام پر

تحریر: عابد شکیل فاروقی

چند دن قبل، مورخہ 17 جنوری 2018 کو پاکستان عوامی تحریک کے جلسے میں تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان اور شیخ رشید کے سلطان راہی برانڈ کے انداز میں، خالی کرسیوں سے مزین ایک جم غفیر کے سامنے، پاکستان کی پارلیمنٹ اور اس کے ممبران کو لعنت بھیجی ہے، عمران خان کے کہنے کے مطابق ایسی پارلیمنٹ کو جہاں چور، لٹیرے، ڈاکو، بدعنوان، لوگ بیٹھے ہوں میں اس پارلیمنٹ پر لعنت بھیجتا ہوں، اور اس سلسلے میں انہوں نے اس پارلیمنٹ سے استعفیٰ دینے کے لئے اپنی پارٹی سے مشورہ کرنے کی اجازت مانگی ہے، اگرچہ ان کو اس کی اب کوئی ضرورت تو نہیں ہے کیونکہ اول تو وہ اس اسمبلی میں اپنی عدم دلچسپی کے باعث نام کے ہی ممبر تھے اور دوسرے ان کی پارٹی تو 2014 کے دھرنوں کے دوران ہی اس پارلیمنٹ سے مستعفی ہو چکی ہے، اور تین چار ماہ، مستعفی ممبران اسمبلی کی حیثیت کے باوجود اسی پارلیمنٹ سے مالی مراعات حاصل کیں جہاں ان کے بقولسارے چور، ڈاکو اور لٹیرے بیٹھے ہیں تو اس پارلیمنٹ سے اس تمام عرصے کی مالی مراعات کا حصول اخلاقی لحاظ سے ویسے بھی ان کا حق نہیں بنتا کیونکہ انکے ووٹرز نے ان کو پارلیمنٹ میں اپنی نمائندگی کے لئے بھیجا تھا، اپنی آواز بننے کے لیے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا نہ کہ صرف مالی مراعات کے حصول کے لیے۔

<u>ایک سچے، ایماندار اور مخلص رہنماء کے فرائض۔</u>

ایک سچے اور غریب پرور لیڈر کا یہ فرض بنتا ہے وہ معاشرے میں جہاں جہاں غریب عوام پر ظلم ہو رہا ہو ان کے حقوق غصب کئے جا رہے ہوں، زندگی ان کے لئے مشکل سے مشکل تر بنا دی گئی ہو، تو وہ ان کے مسائل، انکی شکایات کو بااختیار انتظامی اداروں تک، بااختیار عوامی نمائندوں تک پہنچائے، اگر وہ یہ دیکھ رہا ہو کہ عوام کے نمائندہ فورم پر، عوام کے سچے اور مخلص لیڈرز نہیں بلکہ چور، ڈاکو، لٹیرے اور بدعنوان مافیا قابض ہے تو وہاں تو اور زیادہ ذمے داری بنتی ہے کہ ایسے حالات میں، اقلیت میں ہونے کے باوجود وہ ان قوتوں کے خلاف اپنے ووٹرز کی آواز بنے، ہر ہر فورم پر ہر ہر سطح پر خلوص، ایمانداری اور بہادری سے عوام کا مقدمہ لڑے، نہ کہ پارلیمنٹ سے یہ بہانہ بنا کر اپنا مورچہ چھوڑ دے کہ چونکہ یہاں سب طاقتور ہیں اور میری نظر میں بدعنوان ہیں اس لئے میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔

اگر عوام روایتی سیاستدانوں کی بدعوانیوں، ان کے جھوٹے وعدوں، ان کی لوٹ

کھسوٹ سے تنگ آ کر، اور ان قوتوں کے مضبوط گٹھ جوڑ کے مقابلے کے لئے اس توقع کے ساتھ آپ سے رشتہ جوڑتی ہے کہ اس جنگ میں آپ ان کی جنگ لڑو گے، ان کی آواز بنو گے اسمبلی کے ایوانوں میں ان کے حقوق کا تحفظ کرو گے اور آپ انکے ووٹ لیکر اسمبلی کے ایوان تک پہنچ جاتے ہو مگر وہاں ان کے لئے لڑنے کی بجائے اسمبلی سے ہی غیر حاضر رہتے ہو، ان کی شکایتیں، ان کے مسائل فراموش کر دیتے ہو اور آخر کار یہ کہہ کر باہر آ جاتے ہو کہ یہاں تو سب ہی ڈاکو بیٹھے ہوئے ہیں، مگر اس پورے عرصے میں اپنی مراعات نہیں بھولتے وہ پوری کی پوری وصول کرتے ہو تو یہاں کچھ دال میں کالا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کی پارلیمانی تاریخ میں ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کوئی عوامی رہنما، صرف اس بنا پر عوام کی رہنمائی سے پیچھے ہٹ جائے کہ یہاں تو ہر ادارے، ہر انتظامی محکمے میں کرپٹ عناصر کا قبضہ ہے، اس لئے نہ اس ادارے میں جاؤں گا نہ کسی اور محکمے میں جاؤں گا، جبکہ ریکارڈ گواہ ہے کہ، ان کی پارٹی میں انہی روایتی سیاستدانوں کی تیز رفتار شمولیت پر اور معاشرے میں باکردار اور مخلص عوامی نمائندوں کے قحط کی بابت جب کسی نے عمران خان سے پوچھا تھا تو آپ نے یہی رونا رویا تھا کہ کیا کروں، ہمیں اسی معاشرے سے چننے ہیں کہاں سے لاؤں فرشتے۔

پارلیمنٹ عوام کا نمائندہ ادارہ؟

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے آج کے جدید سیاسی نصاب میں دنیا بھر میں حکمرانوں کے انتخاب کے لئے پارلیمانی جمہوریت ہی ایک واحد تسلیم شدہ راستہ ہے، تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی آبادی، روز بروز تبدیل ہوتے ہوئے معاشی مفادات کے باعث ریاست کی بدلتی ہوئی شکلوں کے انتظام و انصرام کیلئے، قدیم تاریخ کی بادشاہتیں، صاحب کردار اور معاشرے کے سب سے متقی افراد پر مشتمل خلافتیں، امارتیں، راجے مہاراجے، اور قبائلی سرداری جیسے حکمرانی کے طریقے اب قابل عمل نہیں رہے، اس بحث سے قطع نظر کہ کسی ملک میں رائج جمہوریت معاشرے کے کن طبقات کی نمائندگی کر رہی ہے، عوام الناس کے متنوع مفادات کے تحفظ کے لئے اب واحد قابل قبول راستہ یہی پارلیمانی جمہوریت ہی ہے، پاکستان اور اس جیسے پسماندہ ملک میں پارلیمانی جمہوریت میں عوام کی شمولیت حقیقی معنوں میں اگرچہ ایک کاغذی کاروائی ہی ہوتی ہے، جہاں حکمراں کے انتخاب میں عوام کا حصہ صرف ووٹ ڈالنے کی حد تک ہی ہوتا ہے، مگر عمومی معنوں میں ہم اسے ہی عوامی نمائندگی کہنے پر مجبور ہیں، یعنی عوام ہی اپنے ووٹوں سے اس اسمبلی کو چنتے ہیں، اب وہ کن لوگوں کو اس مقدس ایوان کیلئے منتخب کرتے ہیں اس کا دارومدار ہمارے طبقاتی اور سماجی ڈھانچے پر ہے، مضمون کے حوالے سے چونکہ بحث جزیات میں پھیلائی نہیں جا سکتی اس لئے صرف موضوع تک محدود رکھتے ہوئے ہمیں یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ عمران خان جب اسمبلی کو گالی دیتے ہیں، اس پر لعنت بھیجتے ہیں تو کیا یہ لعنت صرف اسمبلی تک محدود رہ سکتی ہے، یا ان کروڑوں ووٹرز تک جائے گی جنہوں نے اس اسمبلی کو منتخب کیا تھا، جنہوں نے اپنے اپنے ووٹوں سے انہی لٹیروں، ڈاکوؤں، کو چنا تھا جنکی وجہ سے آج اسمبلی باعث لعنت بن رہی ہے، دوسرے لفظوں میں کیا عمران خان نے عوام کو بھی لعنتی کہا ہے، تو کیا آئندہ انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے لئے آسمان سے فرشتے اتریں گے، یا اسمبلی میں دھلے دھلائے منتخب نمائندے درآمد کئے جائیں گے۔

پارلیمان دراصل طبقات کی نمائندہ ہوتی ہے

کسی بھی ریاست یا معاشرے میں رائج قوانین دراصل اس معاشرے میں حاوی طبقات کے مفادات کے تحفظ کا ہی نام ہوتا ہے، اس سچائی کی روشنی میں ایک عام سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص، پاکستانی سیاست کی حقیقی تصویر با آسانی اپنے دماغ کے پردے پر اتار سکتا ہے، یا تو عمران خان نہایت ہی معصوم اور سادہ سوچ رکھنے والا سیاست دان ہے، جسنے غالبا پاکستان کی پارلیمانی سیاسی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اسے پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک اس ملک کے سیاسی بساط پر کھیلنے والے سیاسی مہروں سے واقفیت نہیں ہے انکے طبقاتی کرداروں کی سمجھ نہیں ہے اسے پاکستانی سیاست کی گہرایوں کی سمجھ نہیں ہے، اور اس سیاست سے جڑے شخصی اور طبقاتی مفادات کا شعور نہیں ہے، یا پھر واقعی وہ کسی اور کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے، اس کی نظر میں موجودہ اسمبلی میں چونکہ وہ قائد ایوان نہیں بن پایا اس لئے اس کی نظر میں، یہ حکمراں طبقات اور انکے نمائندے ارکان اسمبلی چور ڈاکو، اور لٹیرے ہیں، لیکن اگر وہ آئندہ انتخابات میں انہی ووٹرز کے زریعے قابل زکر اکثریت حاصل کر لیتا ہے تو یہی حکمران طبقات اور انکے نمائندے ارکان اسمبلی اس کی نظر میں شرفاء، قابل احترام پاکباز اور پرہیز گار ٹھہرائے جائیں گے اس کا مشاہدہ تو اگلے انتخابات سے پہلے ہی ہو چکا ہے، پیپلز پارٹی کے جتنے گندے انڈے اپنی پارٹی کو چھوڑ کر تحریک انصاف میں شامل ہو چکے ہیں وہ پاک و صاف اور شفاف ہو چکے ہیں، اس کے بقول انتخاب میں حصہ لینے کے لئے آسمان سے فرشتے تو نہیں اتریں گے، اس کے انہی الفاظ کی روشنی میں میری اس بات سچائی ثابت ہوتی ہے جواب میں کہنے والا ہوں کہ سیاسی حکمرانی دراصل طبقاتی حکمرانی کا ہی تسلسل ہوتی ہے، دنیا کے جن جن ممالک میں پارلیمانی جمہوریت کا

رواج ہے وہاں اس ملک کی پارلیمان اس ملک کے طبقاتی حکمرانی کا پرتو ہوتی ہے، مغربی ممالک، چونکہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام، ورلڈ بنک اور آئی۔ایم۔ایف جیسی مالیاتی تنظیموں کی محافظ ریاستیں ہیں لہذا وہاں کا سیاسی نظام حکومت اور پارلیمان وہاں کے نمائندہ سرمایہ داروں یا انکے نمائندوں کے زیر حکومت نظر آتا ہے یہی لوگ پارلیمان میں پہنچتے ہیں اور پھر حکمرانی کے ذریعے اپنے اپنے معاشی، سیاسی، مفادات کو تحفظ دینے کا کام کرتے ہیں، ہمارے پڑوس میں سرمایہ دارانہ مفادات کا تحفظ بی۔جے۔پی سے جڑے وہاں کے مذہبی مہرے کرتے ہیں، جن کو وہاں کے حکمراں طبقات سے اپنے معاشی مفادات کا ایک مخصوص حصہ مل جاتا ہے، جبکہ ہمارے ایک اور قریبی ملک نیپال میں ہونے والے حالیہ انتخابات سے میری اس بات کی مزید گواہی مل سکتی ہے، جہاں طبقاتی نظام میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے کہ وہاں اس انتخابات کے نتیجے میں کوئی سرمایہ دار یا ان کے نمائندے پارلیمان میں نہیں پہنچ پائے بلکہ مزدور، کسان اور درمیانہ طبقے کے نمائندے پارلیمان میں پہنچے جس وجہ سے وہاں کی پارلیمان ان ہی قوتوں کے مفادات کا تحفظ کریگی، جبکہ ہمارے ملک پاکستان میں ہماری پارلیمان جس کو عمران خان ڈاکوؤں اور لٹیروں کی پارلیمان کہتے ہیں جن قوتوں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے، وہ وہی قوتیں ہیں جنکی ہمارے معاشرے پر حاکمیت ہے، سیاسی شعور رکھنے والا ہر پاکستانی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس ملک پر ابتدا سے لیکر آج تک کون حکمرانی کررہا ہے، اگر نہیں جانتا تو شائد عمران خان ہی نہیں جانتا جو اتنا معصوم ہے کہ اسے صرف ایک موجودہ پارلیمان ہی قابل ملامت نظر آئی، وہ کیوں نہیں کہتا کہ اس ملک میں شروع ہی سے یہی لوگ ایوان اقتدار تک پہنچتے ہیں، جن کو کبھی عوام کے ذریعے نام نہاد انتخابات کے راستے وہاں بھیجا جاتا ہے کبھی کسی وردی والے کے ذریعے آسمانی فرشتے پارلیمان میں پہنچائے جاتے ہیں، کبھی بندوقوں کے سائے میں بیلٹ بکس بھر کر چابی کے مہرے پارلیمان میں سجائے جاتے ہیں، ہماری پارلیمان تو ہمیشہ ہی سے چوروں، ڈاکوؤں، لٹیروں کی میزبانی کرتی آئی ہے، حیرت ہے عمران خان کو صرف موجودہ پارلیمان ہی کرپٹ نظر آئی سب جانتے ہیں کہ قیام پاکستان سے لیکر آج تک اس پارلیمان میں انہی قوتوں کا راج رہا ہے، اگر غلطی سے کبھی ووٹرز نے جاگنے کی کوشش کی بھی تو پارلیمان ہی کو تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے، لیکن اسکی نشستوں کو کبھی حقیق نمائندوں کی ہوا لگنے کی اجازت نہیں دی جاتی، کاش اس حقیقت کو بھی عمران خان کبھی اپنے پورے سیاق سباق کے ساتھ تسلیم کرنے کا حوصلہ کریں اور کھل کر اس کا اظہار کرنیکی ہمت کرسکیں۔☆☆

ٹیکنالوجی نے کیا کیا

تحریر: محمد سعید، لاہور

تمام انسانی وجود کے لیے محنت ایک بنیادی اور اولین شرط ہے جب محنت سے آدمی کا فطرت پر قابو بڑھنا شروع ہوا تو اس کے بڑھتے ہوئے ہر ایک قدم نے اس کی نگاہ کو وسعت بخشی۔ قدرت کی دی ہوئی چیزوں میں وہ برابر نئی اچھوتی 'انجانی خاصیتوں کا پتا لگاتا گیا انسان کو جیسے جیسے فطرت کے رازوں کا علم ہوتا گیا ویسے ویسے فطری لزوم کی گرفت سے بھی زیادہ سے زیادہ آزاد ہوتا گیا محنت اوزار بنانے کے ساتھ ظہور میں آئی جوں جوں اوزار بنانے کا عمل آگے بڑھا انسان طاقت ور پیداواری قوتیں تخلیق کرتا گیا اس عمل میں انسان بھی تبدیلی سے گزرتا گیا اس کا پیداواری تجربہ بڑھتا گیا اور اس کی محنت زیادہ ثمر آور ہوتی گئی۔

پیداواری قوتیں وسائل پیداوار بالخصوص آلات محنت پر جو سماج کے تخلیق کردہ ہوتے ہیں اور عوام پر جو مادی دولت پیدا کرتے ہیں مشتمل ہوتی ہیں تاریخ یہ بتاتی ہے کہ پیداواری ڈھانچے میں آلات محنت پہلے ترقی پاتے ہیں کمتر سے بہتر اور بہتر سے اعلیٰ تر آلات محنت اور ٹیکنالوجی کا اصول ہے۔

مارکس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو محنت کی مادی تجسیم قرار دیا ہے یعنی فطرت کی قوتوں کے علم کو عمل میں بدلنے کا نام ٹیکنالوجی ہے۔Technique فطرت کے حقائق کھوجنے کے کام آتی ہے۔جو Technique ٹیکنالوجی کی ابتدائی شکل ہے بہت ساری ٹ Technics مل کر ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کرتی ہیں مشینوں کے اجزائے ترکیبی Technique کے ذریعے ہوئے جبکہ مشینوں کو پیدا کرنے کے لیے ٹیکنالوجی استعمال ہوئی اور مشینیں اشیاء کی مینوفیکچرنگ کے کام آتی ہیں

ٹیکنالوجی تاریخ' سماج اور کلچر کو حرکت دینے والا لیور ہے آج معاشرہ ترقی کی جس سطح پر ہے جو سماجی ارتقاء ہوا ہے کلچر میں جو گہرائی آئی ہے ٹیکنالوجی کی اس حرکت کا نتیجہ ہے اگر سماج سے تمام ایجادیں' ٹیکنالوجی کی جدتیں خارج کردیں تو ارتقا زوال پذیر ہوکر دور ماضی میں چلا جائے گا۔

ٹیکنالوجی نے مادی وسائل کا بھرپور استفادہ کرتے ہوئے بے پایاں ضروریات زندگی فراہم کی ہیں ٹیکنالوجی کا ارتقا وہ نعمت ہے جس سے جسمانی مشقت کا بوجھ کم سے کم ہوتا چلا گیا ہے دولت میں فراوانی آئی اور سماجی قوت میں گہرائی اور گیرائی ہوتی گئی ہے۔

یہ ٹیکنالوجی ہی ہے جو معاشرے میں تقسیم کار کو بڑھاتی ہے جس سے نئے

پیشے اور نئے شعبے پیدا ہوتے ہیں نئی ٹیکنالوجی شعبوں میں انحصار باہمی کو فروغ دیتی گئی انحصار باہمی سے معاشرتی تعلقات گھنے ہوتے گئے ٹیکنالوجی کے انقلاب نے سماجی کردار کی شرح میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے

ٹیکنالوجی سراپا Materialism ہے یہ کلچر کو متحرک اور تغیر پذیر رکھتی ہے یہ جمود کی دشمن ہے یہ کسی عقیدے پر مبنی کلچر کو تسلیم نہیں کرتی اس کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ذات اس پر حرام اور حلال کے فتوے بے معنی اور غیر موثر ہیں یہ کسی اخلاق کی پابند نہیں۔ ایجادکاری سماجی ڈسپلن اور اخلاقیات کے فروغ میں کثیر پہلو کردار ادا کرتی ہے۔ سماج پر ٹیکنالوجی کے کنٹرول کا جتنا اضافہ ہوتا ہے نیتوں کا فساد اتنا ہی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

سائنسی ترقی کے لوازمات میں سائنسی نگاہ بہت ضروری ہے عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں درس و تدریس کا عمل ابھی تک قومی ثقافت کے اجزائے ترکیبی میں ماضی کے تانے بانے کے ادھیڑ بن میں مصروف ہے سائنس کو اپنے عقائد کے موافق بنانے کے لیے دریافت شدہ فزکس کو پھر سے Metaphysics میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ سائنسی علم ایجاد سے ایک سہولت پیدا کرتا ہے تو اس سہولت کے لیے دوڑ، سماج کا ناک نقشہ بدل دیتی ہے جب جیمز واٹ نے بھاپ کا انجن بنایا تو اس کا مقصد فیوڈل ازم کو توڑنا نہیں تھا وہ تو ایک سہولت پیدا کر رہا تھا مشینوں نے جب فیملی سسٹم کی حیثیت بطور پیداواری یونٹ ختم کر دی تب فیوڈل روایات کی جگہ صنعتی روایات نے لینا شروع کر دی تو یہ صنعت کاری ہی تھی جس نے فیوڈل سسٹم کو توڑ دیا' مزارعہ اور غلامی فیوڈل سسٹم کی ضرورت تھی کیونکہ جنگجو قبیلے کمزور قبیلوں سے مشقت لے کر عیش کرتے تھے۔ مشینوں کی آمد سے پیداوار کا کام مشینوں نے سنبھال لیا مشین چلانے کے لیے غیر ہنر مند مزارع اور غلام کام نہیں دے سکتا تھا مشینوں کے لیے کاریگر مزدوروں کی ضرورت تھی نہ کہ غلاموں کی اس لیے غلامی مشینوں کے لیے بلاضرورت ہوگئی ۔عورت فیوڈل سماج میں حقوق کے لحاظ سے کمتر تھی جو روٹی روزی کے لیے مرد پر انحصار کرتی تھی۔ مشینوں کی آمد سے صنعتی نظام میں شریک ہو کر اقتصادی طور پر آزاد ہوگئی۔

فیوڈل ازم اور سرداری نظام مفتوح ہو کر ختم ہو گیا سائنس کے صنعتی نظام کے انقلاب نے فیملی کے بجائے پوری قوم کو پیداواری یونٹ میں تبدیل کر کے قومی سرمائے کی بین الاقوامی کشمکش کو جنم دیا۔ بھاپ کے انجن کی ایجاد نے دستکاری کو صنعت کاری میں بدل دیا برقی موٹر نے پیداواری یونٹ کو آگے بڑھایا کنویئر بیلٹ سسٹم کی ایجاد نے متنوع کام کرنے والی مشینوں کو ایک یونٹ میں سمو کر پیداواری یونٹ کو مزید بڑھا دیا۔ جب صنعتی انقلاب کے بعد کمپیوٹر انٹرنیٹ خلائی سیارچی ٹیکنالوجی' نیوکلیئر پاور اور جینٹک ٹیکنالوجی کا دور آیا تو قوم جسے پیداواری یونٹ کی حیثیت حاصل تھی اس کی بنیاد بھی فیملی سسٹم کی طرح کمزور پڑنے لگی اب قومی سرمائے کو بین الاقوامی مجبوریاں پیدا ہوگئیں سرمایہ گلوبلائز ہونے لگا دنیا کو گلوبل ویلج کا درجہ ملنے لگا مقابلے کی جدید ضرورتوں نے قومی ریاستوں کو دیوقامت کارپوریشنوں اور اجارہ داریوں کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا۔ آج گلوبلائزیشن اور گلوبل ویلج کی رکنیت کی حقدار صرف وہ قومیں ہیں جن کے پاس سائنس' ٹیکنالوجی صنعت اور سرمائے کی طاقت ہے۔ پسماندہ دنیا پر ان اجارہ داریوں کا تسلط ہونا قدرتی امر تھا جن جن خطوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا فقدان ہے وہ سامراج کی یلغار کے لیے زرخیز خطے ثابت ہوتے ہیں اور ان خطوں پر تسلط جمانے کے لیے زیادہ رکاوٹیں درپیش نہیں ہوتیں۔ اور جو قومیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفیل ہوتی ہیں وہاں سامراجی تسلط ممکن نہیں رہتا۔

ان اجارہ داریوں کی آزاد گلوبل مارکیٹ اقتصادی ضرورت ہے ۔ آج گلوبل قومیں قومی ریاستوں کے مقامی اقتصادی اور سیاسی رول کو کم از کم کرنے کی صلاحیتوں سے مسلح ہیں جب سامراجی سرمایہ کو گلوبلائزیشن کی ضرورت لاحق ہوئی تو سرمائے کی صنعت قائم کرنے کے لیے ادارے کی اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کے تحت ڈی ریگولیشن ڈی کنٹرول ڈی نیشنلائزیشن لبریشن آف ٹریڈ کے نام پر تیسری دنیا میں اسٹیٹ سیکٹر کے اداروں کی حاکمیت کو خزانے پر بوجھ قرار دے کر اپنی راہ سے ہٹانے کی خاطر اپنے تمام لیورز کے ٹرائیگر دبا دیے ہیں۔

آج سائنس براہ راست پیداواری قوت میں بدل رہی ہے۔ سائنسی خود کاری نے تخلیق کی سطح کو بلند کیا ہے مشینیں پیداوار کا بڑا حصہ خود بناتی ہیں انسانی محنت کا کام اس کی نگرانی رہ گیا ہے یعنی علم اور ٹیکنالوجی پیداوار کا مرکزی نقطہ بن گئی ہے آج خود کاری کا عمل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ جنگی ٹیکنالوجی یہاں تک ترقی کر چکی ہے کہ فوج میدان میں نہیں ہوتی' اسلحہ میدان میں ہوتا ہے۔

آٹو مشین خود کاری پیداوری قوتوں کی اعلیٰ شکل ہے جس سے ذرائع پیداوار میں مرکزیت آئی ہے لیکن اس نے نئے مسائل بھی پیدا کیے ہیں صنعتی ورک فورس میں کمی واقع ہوئی ہے پروفیشنل اور تیکنیکی نوکریوں کی بالادستی ہوئی ہے خود کاری سے سروس سیکٹر پھیلا ہے چونکہ ذرائع پیداوار نجی ہاتھوں میں ہیں امارت اور غربت میں تفاوت پیدا ہوئی ہے ۔غربت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے دولت کے ارتکاز نے ملٹی نیشنلز کو قومی ریاستوں سے بڑا کر کے مالیاتی اژدھا بنا دیا ہے۔

ہمارے جیسے پسماندہ ممالک میں دوسری طرح کے مسائل ہیں یقیناً ٹیکنالوجی تہذیب کی ترقی کی نقیب ہے تو ہمارے سماج میں' پسماندہ ممالک میں ٹیکنالوجی کا رستہ فیوڈل ازم نے روکا ہوا ہے۔ گماشتہ سرمایہ داری رکاوٹ ہے۔

روایت پرستی کا جنون رکاوٹ ہے۔عقیدہ پرستی نے روک لگا رکھی ہے۔فرقہ پرستی کی عقل دشمنی حائل ہے۔نسل پرستی کی عصبیتیں' علاقائی قوم پرستی کی نفرتیں راستے کا پتھر ہیں۔سامراج ان تمام رکاوٹوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

انسانیت نے صدیوں کی محنت سے ریزہ ریزہ اور قطرہ قطرہ کر کے علم' سائنس' ٹیکنالوجی کے سرمایہ کو حاصل کیا ہے یہ سرمایہ پیداوار کے ان ذرائع پر مشتمل ہے جو ذہن انسانی کی تخلیق ہے انسانی تخلیقات میں مشین سرمایہ ہے صلاحیتیں اور ہنر سرمایہ ہے۔سائنس اور ٹیکنالوجی سرمایہ ہے۔کرنسی' مارکیٹ' تہذیب اور کلچر سرمایہ ہے۔جب یہ سرمایہ پوری انسانیت کا حاصل ہے تو اس سرمایہ کو کل انسانیت کا چشمہ فیض ہونا چاہیے۔اس سرمایہ کی حاصلات پر چند ہاتھوں کا قبضہ ہے یہ چند ہاتھ یہ چند لوگ کرہ ارض پر دو فیصد سے زیادہ نہیں ہیں جو پوری انسانیت کی حاصلات پر تصرف جمائے ہوئے ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی اور سماجی کارگزاری کا ارتقا تقاضہ کرتا ہے کہ پیداوار تجارت منافع کے نجی اداروں کو عوامی اداروں میں تبدیل کر دیا جائے۔سائنس اور ٹیکنالوجی چند کے لیے نہ ہو سائنسی تخلیقات کا فیض عام ہوتا کہ سماجی کارگزاری کی سطح مزید بلند ہو جب انسانی کارگزاری بڑھے گی تب وہ خوبصورت سماج تخلیق ہوگا وہ جنت ارضی تعمیر ہوگی جس کا انسانیت صدیوں سے خواب دیکھ رہی ہے جہاں انسانی محنت کی ضرورت تو ہوگی' مجبوری نہ ہوگی۔

یہ خواب تبھی شرمندۂ تعبیر ہوگا جب تہی دست لوگ' سماج کے پسے ہوئے لوگ' انسانیت کی حاصلات سے محروم افراد شعور کی بنیاد پر تنظیم کی طاقت سے منافع خوری کے سسٹم کو تہہ و بالا نہ کر دیں ورنہ یہ سسٹم یونہی برقرار رہے گا اور تاریک راہیں انسانیت کی راہ کا پتھر بنی رہیں گی۔

☆☆☆

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سکریٹری اختر حسین کا بیان۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ جس کے تحت سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کو مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے سے بھی نہ صرف نااہل قرار دے دیا گیا ہے بلکہ 28 جولائی 2017 سے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جتنے بھی کام کیے یا احکامات اور ہدایات جاری کی ہیں وہ بھی غیر قانونی قرار دے دیں اس فیصلے پر عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سیکریٹری اور پاکستان بار کونسل کے رکن اختر حسین نے گہری تشویش کا اظہار کیا ہے انہوں نے کہا کہ اس فیصلے سے آنے والے سینیٹ اور عام انتخابات پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے

عوامی ورکرز پارٹی نے ہمیشہ حکمران طبقات کی سیاسی پارٹیوں کی موقع پرستی اور اٹھارویں ترمیم کے وقت 63' 62 اور فیڈرل شریعت کورٹ اور خاص کر آرٹیکل 203-D کو آئین سے نہ نکالنے پر شدید تنقید کی ہے انہوں نے کہا کہ سپریم کارٹ کا یہ فیصلہ اس کے سابقہ فیصلوں جو زیادہ ججوں کی رائے پر مشتمل ہیں کی بھی نفی کرتا ہے کیونکہ ان فیصلوں میں سابقہ چیف جسٹس اور دیگر ججوں کی تقرری غیر آئینی قرار دینے کے باوجود ان کے اس عرصے میں دیے گئے فیصلوں کو قانونی تحفظ دیا گیا تھا اس لیے یہ فیصلہ عوام کی نظر میں امتیازی ظاہر ہوتا ہے انہوں نے کہا کہ اس طرح کے فیصلوں سے غیر یقینی کی صورتِ حال پیدا ہوگی جس سے غیر جمہوری قوتوں کو جمہوری عمل ہی ختم کرنے کا موقع ملے گا

عوامی ورکرز پارٹی کے جنرل سیکریٹری نے کہا کہ ججوں اور خاص کر چیف جسٹس کے عدالت کے اندر اور باہر مختلف متنازعہ سیاسی مسائل پر بیان بازی عدلیہ کے وقار اور مرتبے کے منافی ہے۔انہوں نے کہا کہ امید ہے آئین کی بالادستی اور جمہوری اداروں کے مفاد میں عدلیہ کے جج صاحبان اور سیاسی رہنما غیر جمہوری قوتوں کو یہ موقع نہیں دیں گے کہ وہ پورے جمہوری عمل کو ہی ختم کر دیں۔

خط: جناب اختر حسین صاحب

السلام علیکم! مزاج گرامی، عوامی جمہوریت کے گزشتہ شمارے میں فیصل آباد کی رپورٹ شاید مواد زیادہ ہونے کی وجہ سے چھپ نہ سکی، تصویریں موجود تھیں۔گزشتہ شمارہ میں حمزہ ورک کا مضمون بہت جاندار تھا بار بار پڑھا اور اسے سمجھنے کی کوشش کی۔امید ہے ایسے ہی مضمون جو جانکاری میں اضافہ کریں چھپنے چاہیں ٹیکنالوجی نے کیا کیا کے عنوان سے تحریر بھیج رہا ہوں ہم ادیب تو ہیں نہیں ادنیٰ سے سیاسی کارکن ہیں تحریر میں الفاظ کا چناؤ اور روانی میں گڑبڑ رہتی ہے۔درست فرما کر اگر چھپنے کے قابل ہو تو زیر غور رہنا چاہیے.....شکریہ!

محمد سعید' لاہور

جناب محمد سعید صاحب پسندیدگی کا شکریہ! آپ کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔امید ہے آئندہ بھی اسی طرح مشوروں سے نوازتے رہیں گے۔

مسئلہ کشمیر: کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) کا نقطۂ نظر

(مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں منظور کیا گیا)

ترجمہ: اثر امام، مسلم ابڑو

تعارف: کشمیر کا مسئلہ اسی دن سے ہمارے گلے پڑا ہوا ہے جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ تعلق قائم ہوا گزشتہ چھ دہائیوں کی کشمکش اور ہلچل سے بھرپور تاریخ میں کشمیر ہندوستان کے لیے محض ایک علاقائی مسئلہ ہی نہیں بلکہ اس کی سیکولر جمہوری وفاقی ہیئت کے لیے بھی بہت بڑا امتحان بنا رہا ہے

۱۱ جون ۲۰۱۰ء سے وادی کشمیر بڑے پیمانے پر مسلسل عوامی احتجاج کے باعث جھلس رہی ہے ان احتجاجوں کی خاص بات نوجوانوں کی ان میں شرکت و شمولیت تھی جو قانون نافذ کرنے والے اہل کاروں پر پتھراؤ کر رہے تھے ان عوامی احتجاجوں پر پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں ایک سو گیارہ لوگ جاں بحق اور متعدد زخمی ہوئے جن میں سے اکثر کی عمریں ۲۵ برس سے کم تھیں۔

مذکورہ احتجاج ایک جعلی مقابلے کی خبر کے نتیجے میں ہونے لگے تھے جس کے مطابق تین دیہاتیوں کو حراست میں لینے کے بعد لائن آف کنٹرول پر لے جا کر گولی ماردی گئی تھی تاکہ یہ باور کرایا جاسکے کہ وہ دہشت گرد تھے جو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کی کوشش میں قانون نافذ کرنے والے اہل کاروں کے ہاتھ ہلاک کیے گئے تھے پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں عورتوں اور بچوں سمیت قتل ہونے والے ہر شخص کی موت نے ان احتجاجوں کو مزید بڑھاوا دیا

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نوجوان ان احتجاجی مظاہروں کی بنیادی قوت تھے ان احتجاجی مظاہروں نے کشمیری عوام کے ہندوستان سے علیحدگی پسندی کے احساس کو نمایاں طور پر ظاہر کیا۔ قبل ازیں کشمیری عوام اور ہندوستان کے بیچ میں اتنی بڑی خلیج کبھی نہیں پائی گئی تھی ایسی سنجیدہ صورتحال تقاضہ کرتی ہے کہ کشمیر کے معاملے کا مکمل اور گہرا مطالعہ کیا جائے نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا' (مارکسسٹ) اس مسئلے پر اپنا نقطہ نظر وضاحت سے بیان کرے۔

پس منظر: جموں و کشمیر کی عظیم الشان ریاست میں ہندوستان اور پاکستان کے زیر انتظام کشمیر شامل ہوتا تھا جموں اور کشمیر میں بنیادی طور پر تین علاقہ جات شامل ہیں۔ ایک وادی کشمیر جس کی آبادی 77-54 لاکھ ہے دوسرا جموں جو کہ 3-44 لاکھ آبادی کا علاقہ ہے جبکہ تیسرا لداخ جہاں 36-2 لاکھ نفوس رہتے ہیں۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر سے مراد مظفر آباد والا علاقہ اور شمالی علاقہ جات جن میں گلگت بلتستان اور ہنزہ شامل ہیں۔

کشمیر کے حاکم مہاراجہ ہری سنگھ ہندوستان کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس کے برعکس وہ جموں اور کشمیر کی آزاد ریاست کے حامی تھے چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کشمیر کے متعلق کوئی بھی حتمی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا شیخ عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس جاگیرداریت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھی۔ مذکورہ تحریک اس زمانے کی جاگیرداری اور سامراج مخالف تحریک کا حصہ تھی۔

جیل کی کال کوٹھری میں مقید ہوتے ہوئے بھی شیخ عبداللہ کو آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا تاکہ وہ ''ہندوستان خالی کرو'' تحریک کے قائدین میں شمار کیے جاسکیں۔ لیکن جب پٹھانوں اور صوبہ سرحد (پاکستان) سے تعلق رکھنے والے قابض دستوں نے سری نگر پر ہلہ بولا اور ان کا محاصرہ تنگ کر چکے تب مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان کے کشمیر میں داخلے کی دستاویز پر دستخط کرنے پر رضامندی دکھائی نیشنل کانفرنس کا ساتھ دے چکے کشمیری عوام نے قابض قوتوں کے خلاف لڑائی لڑی دوسری طرف ہندستان اپنی افواج کو طیاروں میں بھر بھر کر سری نگر لایا جس کے نتیجے میں حملہ آور دستوں کو پسپائی پر سامنا کرنا پڑا

انہی حالات کے رہتے آئین ساز اسمبلی نے جو آئین کا مسودہ تیار کر رہی تھی آئین میں شق نمبر ۳۷۰ کا اضافہ کر دیا جس بنا پر جموں اور کشمیر کو ایک خاص حیثیت حاصل ہوگئی جو کہ ہندوستان میں شامل دیگر ریاستوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں تھی گو کہ جموں اور کشمیر کے لیے آئین بنانے والی ان کی اپنی جداگانہ قانون ساز اسمبلی قائم ہونی چاہیے تھی جو جموں اور کشمیر کے لیے نیا آئین جو اس کے لیے صدر اور وزیر اعظم نیز ان کے قومی پرچم وغیرہ کا تعین کرتا جموں اور کشمیر کو وسیع خودمختاری دی گئی مرکزی حکومت (ہندوستان) کے کنٹرول میں فقط دفاع' بیرونی معاملات اور مواصلات ہی کو رہنے دیا جبکہ اس کے علاوہ تمام اختیارات جموں اور کشمیر کی اسمبلی کے سپرد کر دیے گئے۔

متحدہ ہندوستان اور حکومت کشمیر کے نمائندگان کے درمیان ۱۹۵۲ء میں طے پانے والے ''دہلی معاہدے'' میں کشمیر کی اس خصوصی حیثیت کو نسبتاً مزید واضح کیا گیا ہے آئین کی شق ۳۵۲ کی روشنی میں ایمرجنسی کے نفاذ کا اختیار جس پر مرکزی حکومت زیادہ اصرار کررہی تھی اور ریاست کشمیر اس کی مخالف تھی مرکزی حکومت چاہتی تھی کہ کشیر سمیت ملک بھر میں کہیں بھی کبھی بھی ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار اس کے پاس ہونا چاہیے۔ جبکہ ریاست کشیر ایسا اختیار مرکز کو سونپنے کی مخالف تھی۔ (مترجم) کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر میں شق ۳۵۲ اس وقت نافذ العمل ہوگی جب یا تو خود کشمیر کی ریاست اس کا مطالبہ کرے گی یا کم از کم اس پر رضامندی کا اظہار کرے گی لیکن اس کے بعد تو اس بات پر بھی اتفاق ہوگیا تھا کہ ریاست کشمیر میں آئین کی شق ۳۵۶ اور ۳۶۰ استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

گوکہ ریاست جموں اور کشمیر کی آئین ساز اسمبلی نے اس معاہدے کی توثیق کے لیے ایک قرارداد منظور کی تھی نیز ہندوستانی پارلیمنٹ نے بھی اسے تسلیم کیا تھا تاہم اس معاہدے پر کبھی بھی عمل درآمد نہیں ہو پایا۔ تبھی سے جموں اور کشمیر کے اس زمانے کے وزیر اعظم شیخ عبداللہ اور مرکز کے درمیان دوریاں بڑھتی گئیں اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کو اس الزام کے تحت حراست میں لیا گیا کہ وہ کشمیر کی آزادی کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں فقط ۱۹۶۴ء میں آزاد کیا گیا مگر اگلے ہی برس انہیں پھر سے پابند سلاسل کردیا گیا شیخ اور اس کے ساتھیوں کی طویل قید نے وادی کے باشندوں میں بڑے پیمانے پر بے چینی پیدا کی۔

شیخ عبداللہ کی حکومت نے ملک میں زرعی اصلاحات نافذ کیں چونکہ ملکی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا تھا چنانچہ عوام کے اندر نیشنل کانفرنس کی جڑیں پختہ ہونے لگیں حالانکہ اس دوران کئی دیگر مسائل نے سر اٹھانا شروع کردیا تھا مثلاً جموں میں جن سنگھ کے پیشرو پرجا پرشاد نے آئین کی شق نمبر ۳۷۰ اور ''دہلی معاہدے'' کی مخالفت نیز ہندوستان کے ساتھ مکمل الحاق کے حق میں مضبوط تحریک چلائی یہ وہ وقت تھا جب کشمیر میں فرقہ وارانہ تقسیم کا بیج بویا جارہا تھا۔

پاکستان کے ساتھ تکرار: پاکستانیوں کو وادی سے نکل باہر کرنے کے لیے شروع کیے گئے فوجی آپریشن کے دوران پاکستان کی فوج موجودہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوگئی مذکورہ بالا تکرار کے حل کے لیے ہندستان نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے رجوع کیا نتیجتاً فائر بندی کرائی گئی معمولی ترمیم وتبدیلی کے بعد اس فائر بندی کو آج کی لائن آف کنٹرول (LOC) کے نام سے جانا جاتا ہے سلامتی کونسل نے ہندوستان اور پاکستان کے لیے ایک کمیشن بھی تشکیل دیا ہندوستان نے سلامتی کونسل کے سامنے موقف اختیار کیا کہ کشمیر میں امن وامان قائم ہوجائے اور خطے سے مسلح جنگجوؤں کو دھکیل دینے کے بعد عوامی خواہش معلوم کرنے کے لیے وادی میں ریفرنڈم کرانا چاہیے یہی انڈین نیشنل کانگریس کا موقف بھی تھا کہ رجواڑوں کے عوام کو اپنا مستقبل خود طے کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے نہ کہ ان کے حکمرانوں کو۔

مہاراجہ ہری سنگھ کی طرف سے ہندوستان کو قبول کرنے کی درخواست کے جواب میں گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ میری حکومت کی خواہش ہے کہ کشمیر میں جونہی امن وامان قائم ہوجائے اور کشمیر کی سرزمین قبضہ گیروں سے پاک ہوجائے تو وادی کے ریاستی اقتدار کے سوال کو عوامی رائے کے مطابق حل کیا جانا چاہیے بعد کے دنوں میں ہونے والی پیش رفت کے دوران جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر ایک سنجیدہ تنازعہ کی صورت اختیار کرگیا ہندوستان نے ریفرنڈم والا معاملہ پاکستان کے زیر قبضہ کشیر میں پاکستانی افواج کی موجودگی کو سبب بنا کر رد کردیا۔

ان دنوں بین الاقوامی صورت حال اور سرد جنگ کے آغاز نے امریکہ اور برطانیہ کو شہ دی کہ وہ ریفرنڈم کے بارے پاکستانی موقف کی حمایت کریں جو کہ سلامتی کونسل کی ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے مطابق تھا جبکہ سوویت یونین اس کے برعکس ہندوستانی موقف کی حمایت کررہا تھا سوویت یونین نے متعدد مواقع پر سلامتی کونسل کی قراردادوں کو ویٹو کیا جو کہ سلامتی کونسل ہی کی پرانی قراردادوں کے متعلق تھیں اس سلسلے میں امریکہ کشمیر کی آزادی کے لیے خاص طور پر سرگرم تھا تاکہ یہ متوقع نوآزاد ریاست خطے میں اس کے علاقائی سیاسی مفادات کا تحفظ کرسکے۔

وعدہ خلافیوں کی تاریخ: خودمختاری دینے سے انکار کشمیر کی اس کے بعد کی تاریخ جمہوریت سے انکار کی تاریخ ہے یہ شکستہ وعدوں اور ریزہ ہوئے معاہدوں کی تاریخ ہے نیز ہندوستانی حکمران طبقات کی یہ تسلیم کرنے سے نااہلی کی تاریخ ہے کہ آزادی اور تقسیم کے زمانے میں جموں اور کشمیر کو متحدہ ہندوستان میں ایک خصوصی حیثیت حاصل تھی

جن دنوں ہندوستان تقسیم ہورہا تھا اور نسلی فسادات نے شمال مغربی ہندوستان کو اپنی منحوس چادر میں لپیٹ لیا تھا نسلی فسادات کا مرکز پنجاب بنا ہوا تھا تب بھی وادیٔ کشمیر اس قسم کی کشت وخون سے بالکل بھی آلودہ نہ تھی اسی طرح

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جموں نے بڑے پیمانے پر نسلی فسادات کو جھیلا لیکن وادی ان سے پھر بھی محفوظ رہی ایسا خاص طور پر کشمیری لوگوں کی منفرد ثقافتی اور سماجی ہیئت کی وجہ سے ممکن ہوا جسے کشمیریت کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا رعب و دبدبہ ہوتے ہوئے بھی کشمیری لوگوں کا مذہب رواداری اور صوفی ازم کے زیر اثر رہا ہے کشمیر میں برہمنوں کی بیحد قلیل آبادی بھی وادی کی اکثریتی آبادی کے ساتھ امن شانتی کے ساتھ رہتی رہی ہے۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت میں مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف چل رہی تحریک بھی اپنے جوہر میں ایک سیکولر تحریک ہی تھی۔ پاکستان کی طرف سے کشمیر پر حملے کو کشمیری عوام کی شناخت کے لیے خطرہ گردانا گیا تھا اور لوگ اپنی کشمیریت کے تحفظ کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے اور حملہ آوروں کے خلاف لڑنے لگے ہر چند کہ اس وقت ہندوستان نے ان کی مدد کر کے لوگوں کا اعتماد جیت لیا تاہم معاہدوں کی مسلسل خلاف ورزیوں کی وجہ سے کشمیری عوام کا اپنی مخصوص شناخت اور زندگی بسر کرنے کے ان کے مخصوص اور منفرد طریقے کا مطالبہ ان کے آزادی کے جذبے کی کلیدی وجہ رہی ہے۔

جموں اور کشمیر کی اس خصوصی حیثیت کو ابتدا میں قبول کرنے والی ہندوستانی ریاست نے اس حالت کو جاری رکھنے سے انکار کر دیا ۱۹۵۳ء کے بعد مرکزیت پسندی نیز خود مختاری سے انکار کا رجحان پیدا ہونا شروع ہوا جو ساٹھ ستر اور اسی کی دہائیوں میں بتدریج اور مسلسل بڑھتا رہا آئین کے فقرے ۳۷۰ کو توڑ مروڑ کر مسخ کیا گیا اور ریاست کو حاصل خود مختاری کے اکثر حصوں کو ختم کر دینے کے لیے غلط استعمال کیا گیا

جموں اور کشمیر کے متعلق آئینی حکم نامہ ۱۹۵۴ء میں کشمیر کو ہندوستانی یونین میں رہتے ہوئے جو حقوق حاصل ہیں ان کی تفصیل پیش کرتا ہے اور اس میں ریاستی قانون سازی کے فقط وہی آئٹم ہی شامل نہیں ہیں جن کا ذکر حکومتی دستاویزات میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں ۴۲ شقیں بھی جموں و کشمیر کے متعلق تھیں جن سے مرکز کی مداخلت اور قانون سازی کو شہ ملی جو آرٹیکل ۳۷۰ یا ۱۹۵۲ء کے دہلی معاہدے کے دوران تصور تک میں نہیں لائے جاسکتے تھے فقط چند ایک ترامیم کو ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے جمہوری نیز وفاقی اصولوں کے تحت ہندوستانی الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی جموں و کشمیر میں انتخابات کرانا اور ہندوستانی سپریم کورٹ کی ماتحتی میں اداراتی نظام چلانا اس کی دو مثالیں ہیں۔

ریاستی اختیارات پر قبضہ جمانے کے لیے آرٹیکل ۳۷۰ کے غلط استعمال کی وسعت کا اندازہ اس سلسلے میں اٹھائے گئے اقدامات میں سے کسی ایک پر ہی نظر ڈال کر لگایا جاسکتا ہے مثلاً جولائی ۱۹۸۶ء میں محترم صدر صاحب نے آرٹیکل ۳۷۰ اور ۲۴۹ کے تحت ایک حکم نامہ جاری کیا جس کی رو سے پارلیمان کو بااختیار بنایا گیا کہ وہ راجیہ سبھا کی قرارداد کی توثیق کی خاطر قانون سازی کر سکے مرکز کی طرف سے مقررہ کردہ گورنر جگ موہن صاحب نے اس سے اتفاق کیا ریاستی اختیارات کی اس سطح پر پامالی کسی دوسری ریاست میں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جموں و کشمیر بالآخر اپنی اس مخصوص حیثیت سے محروم ہوگئے یہاں تک کہ جو حقوق اور اختیارات دیگر ریاستوں کو حاصل ہیں کشمیر ان سے بھی محروم ہے کانگریس کی بعد میں آنے والی حکومتیں کشمیر کی خود مختاری کے حوالے سے اس انکار اور آرٹیکل ۳۷۰ کی روح سے خائف ہونے کے لیے ذمہ دار تھیں قوت کا سرچشمہ مرکز کو ٹھہرانے اور اپنے ادنیٰ سیاسی مفادات کے حصول کی خاطر کانگریس پارٹی نے ایک مرتبہ نیشنل کانفرنس کو مجبور کیا کہ وہ پردیش کانگریس کمیٹی میں مدغم ہو جائے حالانکہ شیخ عبداللہ نے سمجھوتہ کیا اور کانگریس پارٹی کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ کرنے پر راضی ہوگئے جو کہ نومبر ۱۹۷۴ء کے شیخ عبداللہ۔ اندرا گاندھی معاہدے کی صورت میں سامنے آیا تاہم ہندوستان کی طرف سے اس معاہدے میں شامل حقیر ترین یقین دہانی پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔

1974 کے معاہدے میں یہ حوالہ بھی شامل تھا کہ 1953 کے بعد مرکز کے کچھ ایسے قوانین یا آئینی ترامیم جو کہ ریاست کشمیر پر مرکز کی نگرانی کو سخت بناتی ہیں اگر ریاست کشمیر کے قانون ساز ادارے فیصلہ کریں گے تو خیر سگالی کے جذبے کے تحت مرکز کی طرف سے بنائے گئے قوانین اور آئینی ترامیم واپس لی جائیں گی'' بدقسمتی سے اس پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔

جمہوریت کا انکار: خود مختاری کے خاتمے کی حمایت کرنا جمہوریت کے انکار اور ریاست میں جمہوری حق سے محرومی کے مترادف رہتا آیا ہے۔ بخشی غلام محمد کی وزارت عظمیٰ کے زمانے سے جعلی انتخابات معمول بنے ہوئے ہیں علاوہ ازیں حزب مخالف کے امیدواروں کی نامزدگی فارم رد کرنے کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ 1984 میں فاروق عبداللہ کی حکومت لوٹا کریسی کے ذریعے گرائی گئی اس کی جگہ مصنوعی حکومت لائی گئی جس کے وزیر اعلیٰ سید جی ایم شاہ بنائے گئے اس عرصے کے دوران لوگوں میں بڑے پیمانے پر اشتعال پایا گیا جس کو فرو کرنے کے لیے ہفتوں تک کرفیو نافذ کرنا پڑا جبکہ پولیس کی فائرنگ کے نتیجے میں متعدد لوگ قتل بھی ہوئے۔

جب فاروق عبداللہ نے شکست تسلیم کرلی اور کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تو 1987 کے انتخابات میں بدترین دھاندلی کی گئی ان دنوں حزب اختلاف کا کردار خاص طور پر مسلم متحدہ محاذ ادا کررہا تھا۔ ایسے متعدد اشخاص جو متحدہ مسلم محاذ کا حصہ تھے اور جنہوں نے 1987 کے انتخابات تک میں حصہ لیا تھا بعدازاں علیحدگی پسندوں کے ساتھ مل گئے اور ان میں سے کچھ تو مسلح جدوجہد کرنے لگے۔

1984 اور 1989 کی درمیانی مدت میں جگ موہن کے دومرتبہ گورنر رہنے کے دور کو خاص طور پر 1987 کے انتخابات میں بے حیائی کی حد تک دھاندلیوں، نیز شدت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے مذہبی رہنما میر واعظ کی تجہیز وتکفین کے دوران پولیس کی وحشیانہ فائرنگ کے حوالے سے جانا جاتا ہے جس کے نتیجے میں 45 لوگ مارے گئے تھے۔ جگ موہن نے بعد میں بی جے پی میں شمولیت اختیار کرلی اور کشمیریوں کی مخصوص شناخت کے کٹر مخالف بن گئے۔

بغاوت کا ابھار: ہندوستانی ریاست سے نفرت اور علیحدگی پسندی کی بڑھتی علامات کا پاکستانی حمایت یافتہ قوتوں نے خوب فائدہ اٹھایا جموں وکشمیر آزادی محاذ کی قیادت میں کام کررہے مسلح جدوجہد کے حامی ایک گروہ نے آزادی کے نام پر مسلح جدوجہد کو ازسرنو تشکیل دیا جبکہ اسلامی شدت پسندوں کے گروپ کی نمائندگی حزب المجاہدین کررہی تھی جو جماعت اسلامی کی مسلح تنظیم تھی کافی عرصہ بعد جموں وکشمیر آزادی محاذ (JKLF) ختم ہوگیا اور اس کی جگہ حزب المجاہدین حاوی ہوتا گیا ظاہر ہے کہ اس میں علاقائی خواہ عالمی سطح پر ہونے والی پیش رفت کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا سوویت یونین کے افغانستان سے انخلا کے بعد 1991ء میں ہزاروں مسلح افراد (مجاہدین) کو افغانستان سے نکال کر کشمیر میں مقرر کیا گیا ان طاقت ور مسلح جتھوں نے نوجوان کشمیری مجاہدین کے ساتھ مل کر وادی میں ایک مضبوط فوجی قوت کو جنم دیا یہ وہ زمانہ تھا جب جموں کشمیر میں دہشت گردوں کے تشدد نیز مسلح قوتوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے شروع کیے گئے آپریشن کی وجہ سے وادی میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ 1990ء میں اس تشدد کے نتیجے میں ہزاروں لوگ قتل کیے گئے۔

دھیرے دھیرے پاکستانی حمایت یافتہ خطرناک شدت پسند گروہوں مثلاً حرکت الانصار اور لشکر طیبہ وغیرہ کے بڑے حملوں میں اضافہ اور کشمیری جنگجوؤں کے محدود ہوتے کردار نے لوگوں کو بندوق اور تشدد کی ثقافت کا عادی بنادیا۔

بات چیت کے امکانات: علیحدگی پسند قوتوں نے 1993ء میں ایک سیاسی محاذ قائم کیا جسے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ بعد میں دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اس کے باغی گروہ کی قیادت سید شاہ گیلانی کررہے تھے اس میں کچھ جدت پسندی شامل ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ بات چیت کے نتیجے میں پیش آنے والے کسی بھی حل کی حمایت کرتے ہیں نیز سیاسی عمل، مذاکرات اور ملاقاتوں کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے انہوں نے علیحدگی پسندوں سے مذاکرات کرنے کے لیے بھی مختلف کوشش کیں ہیں باجپائی کی حکومت کے دنوں میں ہندوستان و پاکستان کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے یو پی اے حکومت میں یکطرفہ مذاکرات شروع ہوئے ان برسوں میں علیحدگی پسندوں کے ساتھ مذاکرات کی متعدد بار کوشش کی گئی تاہم اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا کیونکہ ہندوستانی حکومت کے پاس دینے کے لیے کوئی بھی سیاسی ایجنڈا تھا ہی نہیں چنانچہ یو پی اے حکومت کی طرف سے گول میز کانفرنس کے سلسلے میں آخری کوشش بھی اس میں علیحدگی پسندوں کی شمولیت نہیں کراپائی۔

۲۰۰۶-۰۷ کی پیش رفت بھی ہندوستان و پاکستان کی طرف سے ایک دوسرے پر اعتماد کی بحالی کے سلسلے میں اٹھائے گئے اقدامات کا نتیجہ تھی سری نگر۔ مظفر آباد شاہراہ کا کھلنا، پونچ۔ راولاکوٹ بس سروس کو جموں وکشمیر کے سبھی فریقوں نے خوش آمدید کہا تاہم مذاکرات کا یہ عمل نومبر ۲۰۰۸ء میں پاکستانی شدت پسندوں کی طرف سے ممبئی میں جارحانہ کاروائی کے بعد تعطل کا شکار ہوگیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مذاکرات کے اس رکے ہوئے عمل کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

علاقائی وفرقہ وارانہ تقسیم: وادی کے مقابلے میں جموں کے علاقے کی تقسیم جو کہ حقیقی اور سوچی سمجھی تھی اور جسے مناسب طریقے سے حل نہیں کیا گیا تھا ہندو فرقہ پرست قوتوں کے لیے ایک زبردست ہتھیار بن گئی RSS نے اس کا غلط فائدہ اٹھایا اور یہاں تک کہ ریاست کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تین حصوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا ہر چند کہ مذکورہ تقسیم وہاں پر ۱۹۴۷ء سے موجود تھی تاہم شدت پسندوں اور وادی میں اسلامی بنیاد پرستی کے ابھار میں حالیہ اضافہ جس نے کشمیریوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ایسی صورت میں جموں کو کشمیر سے علیحدہ کرنے کا سوال خود علیحدگی پسندوں کی نظر میں بھی اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ جموں میں ہندو آبادی ۵۷ فیصد مسلمان ۳۷ فیصد جبکہ سکھ آبادی چھ فیصد ہے اس طرح جموں میں ہندو بہت زیادہ ہیں جبکہ مسلمانوں کی آبادی بالخصوص راجوڑی پونچھ اور ڈوڈا کے علاقوں میں ہے لداخ ڈویژن جس میں لھہ اور کارگل اضلاع شامل

ہیں میں ۵۲ فیصد بودھ جبکہ ۴۸ فیصد مسلمان ہیں۔ دونوں اضلاع میں علیحدہ اور خودمختار ہل ڈیولپمنٹ کونسلیں ہیں جن میں طاقت کا توازن منقسم ہے۔ پیروی کرنے کے لیے یہ ایک اچھی مثال بھی ہے۔ ضلع لھ یونین ٹیریٹوری کی حیثیت کا خواہاں ہے جبکہ کارگل کشمیر ہی میں رہنا چاہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی خود مختار کونسل کے لیے مزید اختیارات بھی چاہتا ہو۔ وہاں پر بھی مسلمانوں اور بودھوں میں فرقہ وارانہ تقسیم پیدا کی گئی ہے جسے بی جے پی کی مرکزی حکومت کے دوران مزید ہوا دی گئی۔ ۱۹۹۰ء میں وادی سے کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کشمیری روح کے لیے بہت بڑا دھچکہ تھی جموں میں ان کی بطور پناہ گیر سکونت کو ہندو عناصر کی طرف سے فرقہ واریت کو ہوا دینے کے لیے استعمال کیا گیا وہ پنڈت آج تک واپس جانے کے قابل نہیں ہو پائے ہی ۲۰۰۸ء میں امرناتھ مندر کی وقف زمین پر پیدا ہونے والی تکرار کے بعد بی جے پی کے تعینات شدہ گورنر لیفٹننٹ جنرل سنہا کے وہاں اشتعال انگیز کردار نے فرقہ وارانہ تقسیم کو مزید بڑھا دیا ہے احتجاج اور پھر احتجاج کے خلاف احتجاج نے علاقے کے لوگوں کے اتحاد و یگانگت کو توڑ ڈالا ہے جموں میں جوں ہی فرقہ پرست تصورات نے جنم لیا ہے تب سے وادی میں اسلامی بنیاد پرستی بھی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے متعدد تنظیمیں بنیاد پرستی پر مبنی خیالات ونظریات کی تبلیغ کررہی ہیں مذکورہ تنظیمیں سماجی طور پر تنگ نظر لیکن سیاسی اثر رسوخ کی مالک ہیں یہ رجحان کشمیری شناخت کو ختم کررہا ہے جو کہ پہلے کشمیری عوام میں اتحاد و یگانگت کی علامت ہوا کرتا تھا۔

جموں وکشمیر کے مسئلہ کو حل کرتے وقت یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ تینوں علاقوں اور ان کے باشندوں میں توازن کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے اس کے علاوہ ایک جمہوری اور سیکولر ڈھانچہ فراہم کرنا ہوگا جو کہ ریاستی اتحاد کو برقرار رکھ سکے

1948ء سے بعد کے تمام ادوار میں جموں اور کشمیر کے مسئلہ کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کے ذریعے حل کرنے کے حوالے سے متعدد منصوبے منظر عام پر آئے سب سے پہلے اقوام متحدہ کے مشیر اوون ڈکسن کی طرف سے منصوبہ پیش کیا گیا اس منصوبے کے مطابق وادئ کشمیر کو بذریعہ ریفرنڈم علیحدہ کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا جبکہ باقی ماندہ جموں وکشمیر کی ریاست ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کی جانی تھی اس کے بعد پاکستانی ذرائع سے بھی ایسا فارمولا سامنے آیا جس کے مطابق چناب ندی کو سرحد قرار دیتے ہوئے ریاست کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا چناب فارمولے کا دوسرا مطلب ریاست کی فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم بھی لیا جاتا تھا ابتدائی ادوار میں امریکی صاحبان حل وعقد (تھنک ٹینکس) کی طرف سے سفارش کردہ منصوبے بھی ریاست کی فرقہ وارانہ تقسیم کے خطوط پر مبنی ہوتے تھے۔

سیاسی حل کے حوالے سے مشورے: کسی زمانے میں نیشنل کانفرنس کی حکومت نے ایک ریاستی خودمختاری کمیٹی تشکیل دی تھی جس کی پیش کردہ رپورٹ کی توثیق ریاستی قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کی جون ۲۰۰۰ء میں ایک قرارداد کے ذریعے کی گئی جسے بعد میں عمل درآمد کی خاطر مرکزی حکومت کو بھجوادیا گیا باچپائی حکومت نے اس قرارداد کو بالکل سطحی انداز میں مسترد کردیا جبکہ مذکورہ رپورٹ اور اس میں شامل تجویزیں خودمختاری کے سوال اور ریاست میں اس کی تشہیر کے حوالے سے بات چیت کی بنیاد فراہم کرسکتی تھیں۔

سال ۲۰۰۸ء میں پی ڈی پی نے مقامی حکمرانی کا منصوبہ پیش کیا نیشنل کانفرنس کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ خودمختاری ایک محدود تصور ہے اس منصوبے میں جموں وکشمیر ریاست کے مختلف علاقوں میں مقامی افراد کی حکمرانی کی سفارش کی گئی تھی بالکل یہی سفارش پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں کے لیے بھی کی گئی تھی اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا تھا کہ دوطرفہ تعلقات کی خاطر سرحد کو نرم کرنا چاہیے۔

مسلح بغاوت کے بچھڑ جانے کے باعث مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈ نکالنے کے امکانات زیادہ روشن ہوگئے جس کی مزید ہمت افزائی سال ۲۰۰۶ء میں صدر مشرف کے دور حکومت میں ہوئی جب ہندوستان اور پاکستان کے سفیروں کے درمیان خفیہ مذاکرات جاری تھے وزیراعظم من موہن سنگھ نے بیان دیا کہ سرحدیں تبدیل نہیں کی جاسکتیں البتہ انہیں مداخلت سے محفوظ اور آزاد کیا جاسکتا ہے۔ صدر مشرف نے بھی اس بیان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ علاقائی حد بندیوں کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوگا اس نے اپنا چار نکاتی فارمولا پیش کیا جس کے مطابق ریاست جموں اور کشمیر کے مختلف حصے مقامی لوگوں کی حکمرانی پر مبنی ہونے تھے جبکہ عمومی مسائل اور معاملات کو حل کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کو مشترکہ حکمت عملی ترتیب دینی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوکہ مرکزی حکومت کے قائدین نے مختلف اوقات میں تسلسل کے ساتھ اس طرح کے عہد وپیمان کیے ہیں تاہم مسئلے کے سیاسی حل کے حوالے سے کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی ہے نرسمہا راؤ نے وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ حالانکہ خودمختاری کی آخری حد تو آسمان ہی ہے تاہم وہ علیحدگی سے کم کسی بھی مطالبے پر راضی ہوجائیں گے اسی طرح یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت

میں دیوگوندا نے بھی اعلان کیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ خودمختاری دے گا کانگریس پارٹی البتہ جموں وکشمیر کو خودمختاری دینے کے خیال سے بنیادی طور پر خائف ہے یہی وجہ ہے کہ کانگریس جب بھی مرکزی حکومت میں ہوتی ہے تو اس کے تمام اقدامات خودمختاری کے خاتمے اور اس سے انکار پر مبنی ہوتے ہیں اس کا یہی رویہ صورت حال کو مزید خراب کرنے اور علیحدگی پسندی کی طرف لوگوں کی شدید آمادگی کا باعث بنتا ہے۔ بی جے پی تو اپنے ہندومت کے نظریات کی وجہ سے جموں اور کشمیر کی خصوصی حیثیت کو تسلیم کرنے ہی سے منکر ہے یہی نہیں بلکہ وہ تو آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ ہی کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔

ہماری پارٹی کا نقطہ نظر: ہماری پارٹی نے ۱۹۷۰ء کی دہائی سے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ آرٹیکل ۳۷۰ کی روشنی میں خودمختیاری کا انکار خطرناک عمل رہا ہے ہم نے ہمیشہ جموں وکشمیر کے سوال کو ہندوستانی سیکولرازم اور جمہوریت کے لیے آزمائش تصور کیا ہے ہم ہمیشہ یہ مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ جموں اور کشمیر کے مسئلے کو ہندوستانی یونین کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی بات جموں اور کشمیر کی خصوصی حیثیت کو برقرار رکھ سکتی ہے اور یہی بات عوامی امنگوں سے ہم آہنگ بھی ہے بعدازیں ہونے والی پارٹی کانگریسوں بالخصوص ۱۹۹۲ء میں ہونے والی چودھویں پارٹی کانگریس میں پارٹی نے جموں اور کشمیر کے لیے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا مطالبہ کیا تاکہ کشمیری عوام کو یقین دلایا جاسکے کہ ان کی شناخت کا تحفظ کیا جائے گا ہم نے یہ بات بھی کی کہ علاقائی خودمختاری کی سیاسی قراردادوں میں وضاحت کی گئی ہے کہ جہاں تک ہندوستانی یونین کا تعلق ہے کشمیر محض ایک علاقائی تنازعہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک کی سیکولر فطرت اور کشمیری عوام کے ساتھ کیے گئے وعدوں کا امتحان بھی ہے۔ وہ کشمیری عوام جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملہ آوروں کو بے پروائی سے مسترد کردیا تھا اور ہندوستان کو اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت دی ان کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا ہونا چاہیے۔

اسی طرح پارٹی کی اٹھارویں کانگریس کی سیاسی قرارداد میں ہم نے کہا تھا کہ لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف موجود لوگوں کے آپسی میل جول کو بڑھانے کے سلسلے میں اٹھائے جانے والے اقدامات میں مزید تیزی آنی چاہیے ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے لائن آف کنٹرول پر فائر بندی اور وہاں تعینات فوج کی تعداد میں تخفیف کے سلسلے میں ہونے والی بات چیت کو مناسب سیاسی اقدامات کے ساتھ منسلک کیا جانا چاہیے ان سیاسی اقدامات کے ساتھ ساتھ ہم مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ مرکزی حکومت اقتصادی ترقی کے سلسلے میں مدد کرے اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ دے۔

ماضی قریب میں ہونے والی پیش رفت کو مدنظر رکھتے ہوئے پارٹی کی انیسویں کانگریس کی سیاسی قرارداد نے لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف تجارت اور آمدورفت کے راستے کھولنے کے سلسلے میں اٹھائے گئے اقدامات کو سراہا ہے ساتھ ہی اس قرارداد نے پرویز مشرف کے اس بیان کو بھی مثبت تبدیلی کے طور پر لیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ریفرنڈم خواہ نئے سرے سے سرحدیں کھڑی کرنا ممکن نہیں ہے علاوہ ازیں انہوں نے لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب متعدد یونٹوں میں سیلف گورننس کا مشورہ بھی دیا اس مسئلے کے سیاسی حل کے لیے جس میں جموں اور کشمیر کے عوام کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان بھی شامل ہوں ہم بھی کئی ایک منصوبے پیش کرچکے ہیں۔

پارٹی کی انیسویں کانگریس کی سیاسی قرارداد واضح کرتی ہے کہ سیاسی حل مختلف آپشنز پر مشتمل ہونا چاہیے جس میں لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف موجود مختلف علاقوں کے خودمختار یونٹس بھی شامل ہوں یہ ضروری ہے کہ بڑی سیاسی قوتیں تسلیم کرلیں کہ خودمختاری کا تصور مسئلے کے حل کے سینے پر موجود ہے (پیرا نمبر 2;39)

آج کی سوچ کیسی ہونی چاہیے؟ ہماری پارٹی مسلسل جس موقف پر قائم رہی ہے وہ یہ ہے کہ جموں اور کشمیر کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے جو کہ آئین کے آرٹیکل ۳۷۰ سے بھی جھلک رہی ہے اور جہاں تک مسئلے کی بنیاد کا تعلق ہے تو وہ فقط اس بات پر منحصر ہے کہ خودمختاری اور خصوصی حیثیت کو زبانی کلامی اور فی الحقیقت کہاں تک قبول کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ خودمختاری کا ہمارا تصور ایک سیاسی معاہدے کی ضرورت پر منحصر ہے جو عوام کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے جس کی بنیاد پر جموں اور کشمیر ہندوستانی یونین کا حصہ بنے رہے ایسا تبھی ہوسکے گا جب ۱۹۴۸ء میں کشمیری ریاست اور عوام کے ساتھ کیا گیا معاہدہ پورا ہو گزشتہ دو دہائیوں کے دوران تمام سیاسی اور زمینی حقائق بدل گئے ہیں چنانچہ کشمیر کے مسئلے کے حل کے بھی کئی رخ ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان اور پاکستان کو انہیں بھی تمام دیگر پرانے تنازعات کی طرح مل بیٹھ کر حل کرنا ہوگا

مذاکرات کے سیاسی عمل کی خاطر امن سلامتی اور خوشحالی کو بحال کرنے کے لیے مندرجہ ذیل فوری اقدامات کرنے ہوں گے:

۱۔ سب سے پہلے ریاست میں فوجی کابینہ اور ریاستی تشکیل کو بدلنا ہوگا بغاوت اور فوج کشی لازم وملزوم ہیں بیرونی مداخلت بڑی حد تک بڑھ گئی ہے ان دنوں جموں وکشمیر میں ساتھ لاکھ فوجی تعینات ہیں مسلح افواج کی تعداد کم کرنے اور فوج کو لائن آف کنٹرول نیز سرحدی علاقوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے جہاں سے بیرونی مداخلت ہوسکتی ہے وادی کے عوام قابض عسکری ڈھانچے اور کنٹرول سے نجات چاہتے ہیں ریاست کے ایسے حصوں میں Disturbed areas act اور آرمڈ فورسز اسپیشل پاورس ایکٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے جہاں فوج کوئی بھی آپریشن نہیں کررہی۔

۲۔ مسلح عسکری اداروں اور اہل کاروں کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور لوگوں کے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک کی تفتیش کرائی جائے اور مجرموں کو قانونی طریقے سے سزائیں دی جائیں ایسا نہ کرنے سے عوام کا اعتماد کبھی بحال نہیں ہوگا۔ نوجوانوں کی قیادت میں ہونے والے حالیہ احتجاجی مظاہروں کو صرف پولیس کی آنکھ سے دیکھنے کے باعث لاتعداد نوجوان جانیں ضائع ہوئیں ظاہر ہے کہ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مرکزی خواہ ریاستی حکومتوں کو اس سلسلے میں نرمی برتنی پڑے گی اس خدشے کی بنیاد پر کہ کہیں لوگ مسلح بغاوت کا راستہ نہ لے لیں ان پر پولیس کے پٹے کھول دینے کا عمل بند کیا جائے۔

۳۔ اقتصادی سرگرمیوں کی دوبارہ بحالی نیز روزگار کے مواقع پیدا کرنا بالخصوص نوجوانوں کے لیے وقت کی پکار ہے۔

۴۔ جموں اور وادی کے بیچ کے فرق کو ملاحظہ کرتے ہوئے جموں کے عوام کے حقوق اور حقیقی امنگوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ کشمیری پنڈتوں کی وادی میں باعزت واپسی کو امن اور سلامتی کی بحالی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔

سیاسی حل کی بنیادیں: ہماری پارٹی جموں اور کشمیر میں داخلی گفت وشنید کے سلسلے کو آگے بڑھانا پسند کرے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل کرنے کی بنیادیں فراہم ہوں اس کے ساتھ ہم چاہتے ہیں کہ ریاست کے تینوں علاقوں یعنی جموں لداخ اور وادی کی خودمختار شکل وصورت ہونی چاہیے اس سے آرٹیکل ۳۷۰ کی بنیادوں پر قائم کیے گئے قوانین اور احکامات پر نظر ثانی ضروری بن جائے گی نیز آئین اور قانونی تبدیلیاں ناگزیر بن جائیں گی اور بالآخر ایک نیا سیاسی ڈھانچہ نافذ کرنا پڑے گا۔

دوسرا پہلو ہندوستان اور پاکستان کا معاملہ ہے 07-2006 کی بات چیت نے جموں اور کشمیر میں مذاکرات کے لیے خوشگوار ماحول پیدا کیا۔ ۲۰۰۷ء کی فائر بندی نیز شاہراہوں خواہ آمدورفت کے دیگر ذرائع کھولنا ایک اچھی ابتدا تھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات کی ابتدا میں کشمیر کا مسئلہ بہر حال اٹھانا ہی پڑے گا۔ یہاں پر جتنی بات چیت ہوئی یا مشرف کے صدارتی دور میں جو مذاکرات ہوئے اسے آگے لے جانا چاہیے جموں اور کشمیر کی ہندوستانی جانب جو مخصوص حیثیت ہے اسے لائن آف کنٹرول کی دونوں طرف عمل میں لانا اور یہ احساس کرنا چاہیے کہ سرحدوں کی تبدیلی کے بغیر بھی مسئلے کا حل ممکن ہے۔

☆..... جوں جوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بات چیت کا عمل آگے بڑھے گا تو اعتماد کی بحالی کی خاطر مزید اقدامات اٹھائے جاسکتے ہیں تاکہ لائن آف کنٹرول کی دونوں طرف لوگوں کی آمدورفت اور رابطوں کو تقویت دی جاسکے۔ اس میں سری نگر' مظفر آباد کی شاہراہوں پر لوگوں کی آمد ورفت کی آزادی شامل ہے اس کے علاوہ لائن آف کنٹرول کے دونوں طرف زمینی سفر کے لیے نئے راستے نیز تجارتی اور دیگر تعلقات قائم کرنا شامل ہیں ہمارے عہد میں کشمیر اور ہندوستان کے عوام کے بیچ کی خلیج بہت وسیع بن گئی ہے ملک کے دیگر حصوں میں سکونت پذیر لوگوں کو کشمیری عوام کے خلاف ادھر ادھر کی سنا کر گمراہ کیا جارہا ہے بھارتیہ جنتا پارٹی اور دیگر فرقہ وارانہ قوتیں کشمیریوں کو علیحدگی پسند دہشت گرد اور پاکستانی ایجنٹ قرار دیتی ہیں کیونکہ کشمیری مسلمان ہیں۔

یہ از حد ضروری ہے کہ جموں اور کشمیر کے مسئلے کی حقیقی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے عوامی مہم چلا کر شعور پیدا کیا جائے۔ ہمیں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانا پڑے گا کہ کشمیری عوام نے پاکستانی حملہ آوروں کے خلاف لڑائی لڑی تھی اور ہندوستانی یونین میں شامل ہونا چاہا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ علیحدگی پسندی کی طرف اس وجہ سے گئے ہیں کیونکہ ہماری (ہندوستانیوں) کی طرف سے ٹوٹے وعدوں اور شکستہ معاہدوں کی ایک لمبی تاریخ موجود ہے یہ ضروری ہے کہ کشمیری لوگوں کی علیحدگی پسندی کے رجحان کے اسباب کو سمجھتے ہوئے کشمیر کے مسئلے کا سیاسی حل پیش کیا جائے ایسا حل یقیناً جمہوری سیکولر اور وفاقی ڈھانچے میں رہتے ہی ممکن ہے جموں اور کشمیر کی خصوصی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے تصور کی حمایت ہی آگے کی طرف جانے کا راستہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆

ایک نظر

(اس عنوان کے تحت ہم عوامی ورکرز پارٹی کی ملک بھر میں جاری سیاسی وسماجی سرگرمیوں کا جائزہ لیں گے)

ترتیب وتدوین: عابد شکیل فاروقی

☆ عوامی ورکرز پارٹی گلشن / گلستان جوہر کراچی کا ایک اجلاس مورخہ 31 دسمبر 2017 کو زیر صدارت کامریڈ خلیل صدیقی منعقد ہوا اجلاس میں یونٹ کے اراکین کی اکثریت نے شرکت کی، اجلاس میں، یونٹ کو فعال بنانے کے لئے مختلف تجاویز پر غور کیا گیا اور طے کیا گیا کہ پہلے مرحلے پر یونٹ کے غیر متحرک اراکین سے رابطہ کر کے انہیں فعال کیا جائے گا، دوسرے مرحلے پر علاقائی عوامی مسائل پر یونٹ کو متحرک کیا جائے گا

☆ عوامی ورکرز پارٹی ضلع ملتان کے زیر اہتمام شہدائے کالونی ٹیکسٹائل مل ملتان کے شہداء کی یاد میں ایک تعزیتی پروگرام مورخہ یکم جنوری 2018 زیر صدارت ضلعی صدر صبیحہ چوھدری منعقد ہوا جسمیں عوامی ورکرز پارٹی کی مرکزی نائب صدر کامریڈ عابدہ چوھدری، مہمان خصوصی تھیں، پروگرام میں ملتان مختلف ٹریڈ یونینز اور ساوتھ پنجاب ورکرز فیڈریشن کیر ہنماؤں نے شرکت کی اور سانحہ کالونی ٹیکسٹائل مل کے واقعے پر گفتگو کی، ملتان کے سینئر صحافی رشید ارشد سلیمی نے اس سانحے کے حوالے سے خصوصی خطاب کیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی یونٹ بادھ کا ماہانہ اجلاس مورخہ 5 جنوری 2018 کو زیر صدارت ضلعی صدر کامریڈ ذوالفقار بروہی کے منعقد ہوا، جس میں، ممبر شپ میں اضافہ، نئے یونٹس کا قیام، تنظیمی نظم وضبط اور نوجوانوں کے لئے کیریئر کاؤنسلینگ پر لیکچر کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی بادھ کی جانب سے پندرہ روزہ شہید حسن ناصر سٹڈی سرکل کامریڈ مہتاب نوناری کی صدارت میں مورخہ 7 جنوری 2018 پارٹی دفتر میں منعقد کیا گیا جسمیں کامریڈ احمد علی نوناری نے ''ملکی سیاسی صورتحال'' کے موضوع پر گفتگو کی۔

☆ پروگریسو اسٹوڈینٹس فیڈریشن نے عوامی ورکرز پارٹی کراچی کے اشراک سے مورخہ 9 جنوری 2018 کو، تعلیمی اداروں میں طلباء یونین کی بحالی کے موضوع پر ایک سیاسی مکالمے کا انعقاد کیا، جسمیں مختلف طلباء تنظیموں کے نمائندوں کے علاوہ، پارٹی کے جنرل سیکریٹری کامریڈ اختر حسین، شہر کی ممتاز علمی شخصیت پروفیسر توصیف احمد، اور سینئر صحافی مظہر عباس، پارٹی اراکین اور ہمدردوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی، اس کے علاوہ قصور کی معصوم بچی زینب سے زیادتی اور اسکے بہیمانہ قتل کے خلاف ٹاؤن کمیٹی بادھ سے حیدر آباد چوک تک احتجاجی ریلی نکالی گئی، ریلی کی قیادت عوامی ورکرز پارٹی سندھ کے رہنماء کامریڈ اثر امام، مجیب پیرزادہ، احمد علی نوناری اور دوسروں نے کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی پنجاب کے صدر کامریڈ عاصم سجاد نے مورخہ 13 جنوری 2018 کو حافظ آباد کا دورہ کیا اور وہاں انہوں نے ضلع میں پارٹی، کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے مختلف حکمت عملیوں پر پارٹی کے ضلعی عہدداروں سے بات چیت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی یونٹ بادھ کی جانب سے مورخہ 14 جنوری 2018 کیریئر کاؤنسلینگ پر لیکچر پروگرام ''بہتر مستقبل کی تلاش'' کے موضوع پر منعقد کیا گیا جسمیں پروفیسر واحد بخش عباسی نے موضوع پر لیکچر دیا اس موقع پر پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام ضلع لاڑکانہ کے رہنماء کامریڈ مجیب پیزادہ نے پارٹی کے اغراض ومقاصد بیان کئے، پروگرام میں پارٹی اراکین، ہمدردوں اور مختلف اسکولوں کالجوں کے طلباء نے شرکت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی خیبر پختون خواہ کی کابینہ کا ایک اجلاس مورخہ 15 جنوری 2018 کو مردان میں کامریڈ کفایت اللہ کے حجرے میں منعقد ہوا، اجلاس کی صدارت صوبائی صدر کامریڈ شہاب خٹک نے کی، جبکہ اجلاس میں سینئر نائب صدر امیر محمد، جنرل سیکریٹری حیدر زمان، نائب صدر آغا بختیار، ڈپٹی جنرل سیکریٹری قاضی حکیم، سیکریٹری برائے خواتین ریحان شکیل، سیکریٹری اطلاعات وکلچر فقیر شاہ فقیر، لیبر سیکریٹری شیر زادہ، سیکریٹری مالیات فضل مولا کے علاوہ کامریڈ کفایت اللہ، کامریڈ افتخار حسین اور میر انعام اللہ نے شرکت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی راولپنڈی/اسلام آباد کی ایک کارنر میٹنگ، زیر صدارت مرکزی سیکریٹری اطلاعات کامریڈ فرمان علی، مورخہ 15 جنوری 2018 کو غوثیہ ٹاؤن، کے یونٹ مہر آبادی میں منعقد ہوئی، جسمیں دیگر شرکاء کے علاوہ پروفیسر شاہجہان، راولپنڈی/ اسلام آباد پارٹی کے سیکریٹری اور ڈپٹی سیکریٹری، نصرت حسین، اور وقاص ملک نے شرکت کی، میٹنگ میں کالونی میں حالیہ ہونے والی آتشزدگی سے متاثر ہونے والوں سے اظہار ہمدردی کیا گیا اور انہیں خاطر خواہ امداد فراہم کی گئی، علاوہ ازیں کالونی میں شکستہ حال،

بنیادی ڈھانچے کی حالت زار پر بھی غور کیا گیا اور آئندہ کی حکمت عملی پر غور وخوض کیا گیا کہ کالونی میں درکار خستہ حال مکانوں کی بہتری، نکاسئ آب، اور حفظان صحت کی بنیادی ضروریات کے لئے کیا کیا جاسکتا ہے۔

☆ عوامی ورکر پارٹی کراچی نے دنبہ گوٹھ کراچی میں واقع فیکٹری ''اکوافینا'' سے نکالے گئے مزدوروں اور مروجہ لیبر قوانین کو پس پشت ڈال کر مزدور دشمن کاروائیوں کے خلاف، فیکٹری کے باہر 17 جنوری 2018 کو اور کراچی پریس کلب پر مورخہ 18 جنوری 2018 ایک احتجاجی مظاہرہ کیا، جس سے پارٹی کے ضلعی صدر کامریڈ عثمان بلوچ نے خطاب کرتے ہوئے مزدوروں کی فوری بحالی، لیبر قوانین کے اطلاق ا، اور دنبہ گوٹھ کے علاقائی مسائل کے فوری حل کرنے کا مطالبہ کیا۔

☆ مورخہ 19 جنوری 2018 : پاکپتن میں سپریم کورٹ کے ایک حالیہ متنازعہ فیصلے خلاف آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے عوامی ورکرز پارٹی کے رہنما پروفیسر امیر حمزہ ورک کی رہائش گاہ پر ایک اجلاس منعقد کیا گیا، سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں، ہزاروں خاندانوں کو ملکیتی حقوق سے محروم کر کے اوقاف ڈپارٹمنٹ کے رحم وکرم پر دیا جارہا ہے، اجلاس میں شہر کے مختلف علاقوں سے متاثرین اوقاف کے نمائندوں نے شرکت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی نارتھ انگلینڈ کی جانب سے مشال خان کے والد اقبال لالہ اور ملالہ یوسف زئی کے والد ضیاءالدین یوسف زئی کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا اہتمام کیا گیا جسمیں، کامریڈ ذاکر حسین کے علاوہ پارٹی کے کامریڈ پرویز فتح، لالہ محمد یونس، ظاہر شاہ اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے جناب خالد سعید قریشی نے بھی خطاب کیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی سوات اور مقامی کاشتکار کمیٹی کا ایک مشترکہ اجلاس مورخہ 28 جنوری 201 کو مینگورہ کے ایک مقامی ہوٹل میں منعقد ہوا، اس موقع پر، ''فارسٹ ایکٹ'' کے زریعے، مقامی مالکان زمین اور کسانوں کو بیدخل کرنے کے حکومتی منصوبے کے خلاف، ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے پر تفصیلی گفتگو کی گئی، اور فیصلہ کیا گیا کہ 11 مارچ، گراسی گراؤنڈ مینگورہ میں متاثرین کو مجتمع کر کے، مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد شروع کرنے کا اعلان کیا جائیگا، جسمیں عوامی ورکرز پارٹی کی مرکزی قیادت اور قانونی ماہرین کو بھی دعوت دی جائیگی، اس موقع پر عوامی ورکرز پارٹی کے صدر کامریڈ فانوس گجر بھی اجلاس میں موجود تھے۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی ضلع لاڑکانہ کے اجلاس منعقدہ 28 جنوری 2018 میں کئے گئے فیصلوں کی روشنی میں، مورخہ 2 فروری کو بلھڑ یجی میں ایک تنظیمی اجلاس منعقد کیا گیا جسکی صدارت ضلعی پارٹی کے نائب صدر کامریڈ مجیب پیرزادہ نے کی، اجلاس میں بلھڑ یجی میں پارٹی کے یونٹ کے قیام کا اور اس کے عہدداروں کا اعلان کیا گیا، جسکے مطابق، کامریڈ جان محمد، یونٹ کے سیکریٹری، کامریڈ سائھ سومرو ڈپٹی سیکریٹری، اور کامریڈ مقبول پیزادہ کو خزانچی مقرر کیا گیا، اجلاس میں 28 فروری کو بلھڑ یجی میں طے شدہ مشترکہ ضلعی سٹڈی سرکل کے انتظامات اور اس کے گردونواح میں پارٹی کو مزید متعارف کرانے کی حکمت عملی پر غور کیا گیا، اجلاس میں پارٹی کے صوبائی نائب صدر کامریڈ اثر امام، ضلعی پریس سیکریٹری کامریڈ اسرار نوناری، یونٹ بادہ کے سیکریٹری منور سندیلو اور سیکریٹری تعلیم وتربیت عامر میرانی نے شرکت کی۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی پنجاب نیشنل کمیٹی کا تیسرا اجلاس مورخہ 5 فروری 2018 کو لاہور پارٹی دفتر میں منعقد کیا گیا، جسمیں تنظیمی امور کے علاوہ دیگر امور بھی زیر بحث آئے، اجلاس میں بعض اہم فیصلے کئے گئے، جنکا تعلق، کسانوں کے مسائل پر تقریب کا انعقاد، بائیں بازو کی تنظیموں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کی حکمت عملی، پنجاب میں پارٹی کی ممبرسازی کی مہم، آئندہ آنے والے الیکشن کے لئے حکمت عملی اور تجاویز۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب کمیٹی ایک غیر معمولی اجلاس 18-17 مارچ کو منعقد کیا جائے گا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی برطانیہ اور ساؤتھ ایشین پیپلز فورم کے زیر اہتمام مورخہ 10 فروری بریڈفورڈ میں ایک تقریب منعقد کی گئی جسمیں ملالہ اور مشال خان کے والد گرامی جناب ضیا الدین یوسف زئی اور اقبال لالہ نے خصوصی طور پر شرکت کی تقریب سے بریڈفورڈ سابق میئر جناب محمد نجیب باجی نسیم شمیم ملک زاکر حسین، پرویز فتح اور لالہ یونس نے خطاب کیا۔

☆ عوامی ورکرز پارٹی نیشنل کمیٹی سندھ کا ایک اہم اجلاس مورخہ 10 فروری کراچی پارٹی آفس میں منعقد ہوا جسمیں نیشنل کمیٹی کے صدر اور سیکریٹری کامریڈ بخشل تھلو، اور کامریڈ یونس راہو کے علاوہ اراکین کی اکثریت کے ساتھ ساتھ سندھ سے فیڈرل کمیٹی کے اراکین یوسف مستی خان، سینئر نائب صدر، اختر حسین، مرکزی سیکریٹری جنرل، جاوید اختر، مرکزی آرگنائزنگ سیکریٹری، حسن عسکری، مرکزی کسان سیکریٹری نے بھی شرکت کی، اجلاس کی صدارت پارٹی کے صوبائی صدر نے کی، اجلاس میں صوبے میں نو تشکیل شدہ سکھر اور گھوٹکی یونٹ کے ساتھیوں نے بھی شرکت کی، اجلاس میں صوبائی پارٹی کے اندرونی تنظیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی جبکہ وقت کی کمی باعث ایجنڈے کو مختصر کرنا پڑا، رسمی کاروائی کے علاوہ اجلاس سے پارٹی کے سینئر نائب صدر کامریڈ یوسف مستی خان اور سیکریٹری جنرل کامریڈ اختر حسین نے بھی خطاب کیا۔ ○

عوامی ورکرز پارٹی سوات/سوات مقامی کاشتکار کمیٹی کے اجلاس سے کامریڈ فانوس گجر کا خطاب

آر ایس ایف کے زیر اہتمام تعلیمی اداروں میں یونین کی بحالی کے موضوع پر کراچی میں منعقدہ تقریب

اسلام آباد میں منعقدہ پشتون لونگ مارچ دھرنے سے کامریڈ فانوس گجر کا خطاب

اوہ وی خوب دیہاڑے سن

اوہ وی خوب دیہاڑے سن
بھکھ لگدی سی
منگ لیندے ساں
مل جاندا سی
کھا لیندے ساں
نئیں ملد اسی رو پیندے ساں
روندے روندے سوں رہندے ساں
ایہہ وی خوب دیہاڑے نیں
بھکھ لگدی اے
منگ نئیں سکدے
مل دا اے تے کھا نئیں سکدے
نئیں ملدا تے
رو نہیں سکدے
نہ رویئے تے سوں نئیں سکدے

منو بھائی